ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

Please examine the book before taking it out. You will be responsible for damages to the book discovered while returning it.

DUE DATE

Cl. No ______ *Acc. No.* ______

Late Fine Ordinary Books **25 Paise** per day. **Text Book Re. 1/-** per day. Over Night Book **Re. 1/-** per day.

الاصلاح

۱۹۶

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

دائرہ حمیدیہ کی اردو مطبوعات

تفسیر سورۂ اخلاص

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورہ اخلاص کی تفسیر اردو میں لکھی ہے، اس سورہ کی، مرور دہر میں بیشمار تفسیریں لکھی گئیں۔ لیکن اہل نظر نے اعتراف کیا ہے کہ علامہ فراہی کی تفسیر میں جو نکتے بیان ہوئے ہیں، ان سے تمام تفسیریں خالی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین کاغذ نہایت عمدہ۔ قیمت :- ۵ر

تفسیر سورۂ والتین

استاذ امام علامہ فراہی رحمہ اللہ کی تفسیر سورۂ والتین کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں تین، زیتون، طور سینین اور بلد امین سے وجوہ استشہاد اور ان کی تحقیق کے متعلق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ تحقیق اور وسعت نظر کا اعجاز ہے۔ قیمت ۲ر

تفسیر سورۂ کوثر

استاذ امام مولانا فراہی رحمہ اللہ کی تفسیر سورہ کوثر کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں کوثر کی تحقیق، خانہ کعبہ کی روحانی حقیقت اور نماز اور قربانی کے اسرار و حقائق پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت و طباعت جاذب نظر تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۲۳ صفحہ۔ قیمت ۸ر

جلد ۳	ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۳۹ء	ن

MUSLIM UNIVERSITY
DELHI

فہرست مضامین

شذرات | امین احسن اصلاحی | ۲ - ۸

معارف قرآن

تفسیر سورہ تحریم | استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ | ۹ - ۱۹
ذبیح کون ہے؟ | ” ” ” | ۲۰ - ۳۲
ذبیحۂ ابراہیمی | جناب مولوی داؤد اکبر صاحب اصلاحی | ۳۳-۴۲

مقالات

۴

سیرت شبلی (۱۵) | جناب مولانا اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے علیگ | ۴۳-۴۷

ادبیات

نذر عقیدت | جناب مرزا احسان احمد صاحب ایم اے علیگ | ۴۸-۵۰

تقریظ و تبصرہ

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش | ا - ن | ۵۱ - ۶۴

SVOD

169267
Date 23.1.96

شذرات

قومیت اور ملیت "مسلمان اور متحدہ قومیت ہند" کے موضوع پر جس طرح آج اخبارات میں گرماگرم بحثوں کا سلسلہ جاری ہے اسی طرح سنہ ۱۹۲۶ء میں بھی یہ مسئلہ "انڈین نیشنل یونین" کے قیام کی تقریب سے چھڑا تھا۔ اس زمانہ میں مولانا محمد علیؒ مرحوم نے اپنے اخبار ہمدرد میں بعض مضامین لکھے تھے جن کے بعض فقرے میری حافظہ میں محفوظ تھے اور اصل مضمون کے دوبارہ دیکھنے کی خواہش بار بار دل میں چٹکیاں لیتی تھی۔ مگر نہ اس کے تلاش کے لئے فرصت میسر آئی، نہ یہ مطلوب عزیز آپ سے آپ ہاتھ آیا۔ کل مکتبہ جامعہ سے کتابوں کا ایک پارسل ریویو کے لئے آیا، اس میں ایک کتاب "مضامین محمد علیؒ" کے نام سے بھی نکلی جو مولاناؒ کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کو الٹا پلٹا تو اتفاق سے وہ مضمون بھی نکل آیا، جس کو دیکھکر بڑی خوشی ہوئی۔ اور جی چاہا کہ اس سے استفادہ میں، قارئین بھی شریک ہوں۔

اس وقت اس کتاب کے ذکر کی تقریب یہی مضمون ہے ۔ ۔ اس پر اور دوسری کتابوں پر تبصرہ انشاءاللہ اگلی اشاعت سے نکل سکے گا اوہر کئی مہینہ سے عام تقریظ و تبصرہ کا سلسلہ بند ہوجانے کی وجہ سے کتابوں کا اچھا خاصہ انبار جمع ہوگیا ہے۔ حضرات مصنفین و ناشرین سے اس مجبورانہ تاخیر و تقصیر خدمت پر معافی چاہتے ہیں۔

انڈین نیشنل یونین کے قیام کی تحریک پنڈت موتی لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک مشترک عدات سے ہوئی تھی اور مقصود یہ تھا کہ لوگوں میں قومیت، حب الوطنی اور یگانگت کے جذبات پیدا ہوں لیکن چونکہ

اس میں شریک ہونے والے لوگوں کے لئے یہ شرط بھی تھی کہ وہ کھلی ہوئی فرقہ وارانہ انجمنوں کے ممبر نہیں ہو سکتے اسلئے بعض لوگوں کو یہ خوف پیدا ہوگیا کہ یہ نئی مجلس ہندوستان میں صرف وجود قومیت کی خواہاں نہیں ہے بلکہ وجود مذہب وملت کی دشمن بھی ہے۔ خود مولانا بھی اس کو اسی نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ ان کا یہ فقرہ اس انجمن کے متعلق ہمیشہ یاد رکھا جائیگا

> "اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے اور انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن نے دوزخ کی جو تصویر کھینچی ہے اس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس کے دروازے پر کندہ ہے کہ جو شخص اس میں داخل ہو، امید کو باہر چھوڑ آئے۔ پنڈت موتی لال نہرو صاحب اور مولانا ابوالکلام آزاد نے بظاہر ایک نئی جہنم پیدا کرنی چاہی تھی جس کے دروازہ پر کندہ ہوگا کہ جو اس میں داخل ہونا چاہے وہ ملت و مذہب کو باہر چھوڑ آئے"

مولانا صاحب کسی چیز کے مخالف ہو جاتے تھے تو اس کے ابطال میں قلم کا پورا زور صرف کر دیتے تھے۔ تاہم معاملہ کے اصل نقطہ سے ان کی نگاہ نہیں ہٹتی تھی۔ اس مضمون کے جستہ جستہ فقرے ہم اس لئے یہاں نقل کرتے ہیں، تاکہ اس مسئلہ پر ان کا نقطہ نظر لوگوں کے سامنے آجائے۔

> "وہ فرقہ وارانہ جدوجہد جو دوسرے فرقوں سے دشمنی رکھنے کے باعث کی جائے یقیناً ایک مختلف الاجزاء مگر متحدہ اور مشترکہ قومیت کے منافی ہے، جس کا پیدا کرنا اور جس کو تربیت دینا ہر محب وطن اور وطن پرور ہندوستانی کا فرض ہے۔"

> "دنیا کی تقسیم جغرافیائی یا بنی آدم میں اختلاف نسل کے متعلق ہماری کوتاہ نظر میں قومیت کی تکوین کا باعث ہوتی ہیں لیکن برخلاف اس کے اختلاف عقائد جو ذوی العقول کے لئے سب سے زیادہ منطقی تقسیم کے سبب ہوتے ہیں تکوین ملیت کا باعث ہیں۔ اس معنی میں ملیت قومیت کی منافی ہے اور۔ اسلام نے دنیا کو سیاسین یورپ کی طرح قوموں اور ملکوں میں تقسیم نہیں کیا ہے۔ بلکہ ذوی العقول کو اختلافات عقلی یعنی اختلافات مذہبی کی بنا پر ملتوں میں تقسیم کیا ہے لیکن اس معنی میں بھی ملیت قومیت کی اسقدر منافی نہیں ہے کہ مختلف ملتوں کا وجود ہی قومیت

کو پیدا نہ ہونے دے۔ ہماری سیاست ہمیں بعض اوقات مجبور کرتی ہے کہ ہم پہلی تقسیم پر زور دیں اور بسا اوقات اس تقسیم پر زور دینا ہمارا فرض ہو جاتا ہے لیکن حقیقی اور صحیح تقسیم دوسری ہے۔“

آگے چلکر فرماتے ہیں :-

> ”اسلام نے دنیا کو مسلم و کافر دو ملتوں میں ضرور تقسیم کیا ہے لیکن کیا اسلام نے اس کی اجازت دی ہے کہ اپنی ملت کی محبت میں کوئی مسلمان اتنا سرشار ہو جائے کہ بنی آدم کے ساتھ انصاف کو کلیتہ ترک کر دے۔“

پھر فرماتے ہیں :-

> ایک مسلمان اس قومیت کا ہرگز طرفدار نہیں ہو سکتا جو اسے اپنے دینی بھائیوں کی تنظیم سے باز رکھے لیکن وہ اس ملیت کا بھی طرفدار نہیں ہو سکتا جس کی طرف بعض مسلمان اسے گھسیٹنا چاہتے ہیں اور ہمیشہ اسے اپنا فرض سمجھے گا کہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم پر ظلم کرے تو یہی نہیں کہ اس کو اس ظلم میں مدد نہ دے بلکہ اسے اس ظلم سے باز بھی رکھے۔

مولانا نے اس معاملہ میں ٹھیک وسط و اعتدال کی راہ اختیار کی ہے اور یہی الاصلاح کا بھی نقطۂ نظر ہے۔ ہندوستان میں ایک متحدہ اور مشترک قومیت کے نقطۂ نظر سے ہمیں اختلاف نہیں ہے بشرطیکہ وہ مختلف الاجزا ہو اور ایسی صورتیں نظام حکومت میں اختیار کی جائیں جو مختلف اجزاء کے امتیازات و خصوصیات اور ان کے حقوق و اختیارات کا ٹھیک ٹھیک تحفظ کر دیں۔ اس کے بغیر خالص وطنی بنیاد پر قومیت کا تصور ہندوستان کی مختلف قوموں میں پیدا ہونا ناممکن ہے۔ اس میں سر کھپانے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ کانگریس اگر اختلافات کی خلیج اور زیادہ وسیع نہیں کرنا چاہتی تو اس کا فرض ہے کہ وہ معاملہ پر اس نقطۂ نظر سے غور کرے ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں ہندوستان دو حصوں میں تقسیم نہ ہو جائے۔

علما کے مناقب! ایک معزز معاصر نے اپنے صفحات میں کسی صاحب کا ایک مضمون شائع کیا ہے۔ اس مضمون میں ضمنا علما کے مناقب بھی صاحب مضمون کے زبان قلم پر آگئے ہیں۔ اس کے چند فقرے

ن کرتا ہوں۔

"آجکل کے علماء دو نفسی بیماریوں کے مریض ہیں۔ ایک جہل مرکب اور دوسری حقارت مرکب۔ یعنی ہر "عالم" جاہل ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی خود کو عالم اجل سمجھتا ہے اسی طرح وہ ہر اعتبار سے حقیر ہوتا ہے لیکن ہمیشہ اپنے نفس کو فریب دیتا ہے کہ وہ حقیر نہیں ہے آپ ان "علماء" میں سے کسی سے بات کیجئے۔ آپ کو بہت جلد ان دونوں صفتوں کا اندازہ ہو جائے گا۔ ہمارا ہر عالم چوبیس گھنٹے اسی فکر میں رہتا ہے کہ اسے کوئی جاہل نہ سمجھے یا اسے کوئی حقیر نہ سمجھے، جہل اور حقارت کا چور اس کے دل میں چھپا ہوتا ہے اس لئے وہ ہر آن و ہر لحظہ اسی چور سے لڑتا رہتا ہے۔ بس اسکا یہی کام ہے، اس کے سوا اس کی نفسیات کا تجزیہ اور کچھ نہیں"۔

"جن بیچاروں کو نہ سوئزرلینڈ کا حال معلوم ہے نہ انگلینڈ کا، جو نہ کانسٹی ٹیوشن کو جانیں نہ جمہوریت کو، نہ انھیں یہ پتہ کہ فرانس میں انقلاب کیوں آیا یا روس میں سوشلزم کیوں چمکا، وہی آج ہماری بدنصیبی سے اسٹیج پر چڑھا چڑھا کر ہماری ناؤ کھینے کے دعویدار بنے ہوئے ہیں"۔

ان گالیوں کا انداز ذرا فلسفیانہ تھا اس لئے میں نے ان کو اقتباس کرلیا ہے۔ باقی ایک لمبی فہرست بازار کے چبوترے والی گالیوں کی بھی ہے۔ بعض حضرات تو تمام بنام زد میں آگئے ہیں۔ صرف دو صلحاء اس قتل عام سے بچے ہیں۔ بارک اللہ فیہما وکثر اللہ امثالہما۔

جن صاحب نے یہ خیالات ظاہر کئے ہیں ان سے کسی شکایت کا موقع نہیں ہے۔ یہ جذبات واحساسات تنہا انہی کے دل کے نہیں ہیں۔ آج عام طور پر علماء، عربی مدارس، عربی تعلیم کے متعلق جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے خیالات یہی ہیں۔ اور یہ خیالات اب آہستہ آہستہ عوام میں بھی پھیل رہے ہیں۔ ان خیالات میں سیاسی اختلافات کو بھی کچھ ایسا دخل نہیں ہے۔ صاحب مضمون نے علماء پر جو اسٹیم رولر چلایا ہے اس میں اس طرح کی بھی کوئی تفریق نہیں معلوم ہوتی۔ ایسی حالت میں غصہ ہونے کے بجائے ایسے لوگوں کو فیاضی سے معاف کر دینا چاہیے۔

پھر ویسے بھی جب انھوں نے اپنا نام چھپایا ہے۔ تو ان سے درگذر کرنا ہی بہتر ہے۔ ہم کو اصل مسئلہ پر غور کرنا چاہئے کہ ان تمام اتہامات میں کتنی حقیقت ہے۔ اور اس کے دور کرنے کی کیا شکل ہے؟

اس میں ذرا بھی شبہہ نہیں ہے کہ عام طور پر عربی مدارس میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور طلبہ کے سامنے جو چیزیں پیش کی جاتی ہیں ان کو ہماری موجودہ عملی زندگی کے احوال و مسائل سے بہت کم تعلق ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں یا تو ہمیں یہ کرنا چاہئے کہ ہم انھیں جس عالم کی تعلیم دیتے ہیں اسی عالم میں انھیں جینے اور زندگی بسر کرنے کیلئے بھی بھیجدیں اور اس عالم میں قدم بھی نہ رکھنے دیں یا یہ کریں کہ انھیں اس عالم کے احوال و مسائل سے بھی باقاعدہ آگاہ کریں۔ یہ کیا کہ ہم انھیں خشکی میں جینے کا تو ڈھنگ سکھاتے ہیں اور پھر اس دنیا کی سیاسیات کے سمندر میں لاکر ڈال دیتے ہیں۔ اس صورت حالات کے جو نتائج ہو سکتے تھے وہ اب سامنے آرہے ہیں اور حیف ہے اگر ہمارے ارباب حل و عقد اب بھی اس پر غور نہ کریں۔ عربی مدارس کو موجودہ ڈھرے پر گھسیٹتے رہنا درحقیقت، علماءؑ، مذہب، علوم اسلامیہ اور ان مدارس، سب کا چند دنوں کے بعد خاتمہ کردینا ہے۔ اب اگر ان کو زندہ رکھنا ہے تو نصابوں اور طریق تعلیم کی تبدیلی میں ایک لمحہ کا توقف بھی موت کے مرادف ہے ۔۔ دینی علوم کیا ہیں؟ قرآن، حدیث، قانون اسلامی۔ ان کے علاوہ نصابوں سے تمام غیر ضروری کتابوں کا بوجھ ہٹا کر جدید فلسفہ کی بعض ضروری اور مفید شاخوں اور انگریزی زبان کا اضافہ کرنا چاہئے۔ بعض عربی مدارس میں انگریزی کی چند ریڈریں جو پڑھائی جاتی ہیں یہ بالکل مفید مقصد نہیں ہے۔ سر سیدؒ نے کالج میں مذہبی تعلیم بھی رکھی تھی جو بقول اکبر مرحوم بادہ گلگوں میں تھوڑی سی زمزم تھی، ہم نے اسی کو الٹا کر زمزم میں چند بوندیں بادۂ گلگوں کی ملادیں، اس سے کیا ہوتا ہے! جدید علوم و فنون تو علماء ہی کے پڑھنے کے لئے تھے، یہی اس کے غث و ثمین کو پہچان سکتے تھے، یہ دینی تعلیم الگ اور دنیاوی تعلیم الگ کا فلسفہ جن لوگوں نے اختیار کیا، اللہ تعالیٰ ان کو معاف کرے کہ انہی کے بوئے ہوئے تخم فساد کے مسموم برگ و بار ہیں جن کے سایہ کے نیچے آج مذہب کا دم گھٹ رہا ہے۔

بہرحال ملک کے خاص خاص نمایاں عربی مدارس کو فوراً بدل جانا چاہئے۔ لوگوں میں پرانی لکیر کو چھوڑنے کی ہمت پیدا ہو جائے تو ہمارا خیال ہے کہ روپیہ کی مشکل کچھ بہت لاینحل نہیں ہے۔ قوم میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ عربی مدارس کی تعلیم مفید اور ترقی بخش ہے تو اس طرح کی اصلاحات کے لئے اس کے پاس بہت روپیہ ہے۔ جو قوم علی گڑھ کالج بنا سکتی ہے درانحالیکہ اس سے اس نے جتنی توقعات وابستہ کی تھیں ان میں سے ایک بھی پوری نہ ہوئی وہ ایک ایسے دارالعلوم کی کفالت سے عاجز نہ رہے گی جو علوم جدیدہ کی تعلیم قرآن و حدیث کے ماتحت رکھ کر دے۔ ہمیں امید ہے کہ اب ہمارے علماء اس کے لئے ہمت کریں گے ورنہ دنیا کی سیاست میں، جدید تعلیم یافتوں کے مقابل میں ان کی حیثیت وہی ہوگی کہ

ع بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است

فاتحہ تفسیر نظام القرآن استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفسیر نظام القرآن کا مقدمہ جو تفسیر بسم اللہ اور تفسیر سورہ فاتحہ کے ساتھ چھاپا گیا ہے، قارئین اور معاصرین کی خدمت میں الاصلاح بابت دسمبر ۱۹۳۸ء کے عوض بھیجا گیا ہے۔ اس کی ترتیب کی خدمت اخویم مولوی اختر احسن صاحب اصلاحی نے انجام دی ہے اور طباعت کا اہتمام برادرم مولوی حافظ عبدالاحد صاحب اصلاحی منیجر دائرہ حمیدیہ کی کوششوں کا رہین احسان ہے۔ کتاب کے قدرداں ان کی کوششوں کو قبول فرمائیں ہم سب اپنے مخدوم حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کے شکرگزار ہیں جنہوں نے ترتیب و تہذیب کی تمام مشکلات میں رہنمائی فرمائی اور ان کی رہنمائی سے ان منتشر اوراق نے کتاب کی شکل اختیار کی۔

مخدومی جناب حاجی حافظ ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب صدر دائرہ اور مخدومی جناب شیخ سلیمان صاحب رکن دائرہ کے عطیات نے اس کتاب کے چھاپنے کی ہمت دلائی اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب کے اور قوم کی طرف سے شکریہ کے اصلی مستحق یہی لوگ ہیں۔ شکر اللہ مساعیہم

۷

معاصرین سے التجا ہے کہ اپنے موقر صفحات میں اسکا ذکر فرمادیں، اور قارئین سے التماس ہے کہ اسکی اشاعت میں مدد کریں۔ اسکی قیمت ۱۲؍ ہے۔

مولوی اختر احسن صاحب اس کتاب سے فارغ ہونے کے بعد اب تفسیر سورۂ بقرہ کی ترتیب میں مشغول ہیں، خدا نے چاہا اور کسی بندۂ خدا کو ہمارے کاموں سے ہمدردی ہوگئی تو انشاء اللہ چند مہینے کے اندر اندر یہ کتاب بھی شائع ہو جائیگی۔

مولانا کی غیر مطبوعہ تصنیفات کا صندوق ایک بار امانت ہے جس کو ہم لوگوں نے خدا کے بھروسہ پر اپنے سروں پر اٹھا لیا ہے دیکھئے اس امانت کی ادائگی سے سبکدوشی کی سعادت کب حاصل ہوتی ہے۔

الاصلاح کے پڑھنے والوں میں سے جو حضرات عربی سے ناواقف ہیں وہ ایک خسارہ محسوس کرتے ہوں گے کہ انھیں ایک ایسی چیز دیگئی ہے جس سے وہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ مگر انھیں یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ دائرہ حمیدیہ جس کی وہ سرپرستی فرمارہے ہیں، کے کاموں میں کوئی چیز بھی خسارہ اور نفع کے پیمانہ سے نہیں تولی جاتی ہے۔ الاصلاح نکلتا ہے چند سو روپئے سالانہ خسارہ کے ساتھ، کتابیں نکلتی ہیں، جن سے مشکل سے اس ملک کے چند گنتی کے اصحاب علم فائدہ اٹھاتے ہیں، پس جب بازار میں خسارہ ہی کا کاروبار شب و روز ہوتا ہو، اور جب ولایت میں سود و نفع کے نام سے بھی لوگ واقف نہ ہوں، اگر اتفاق سے یہیں ان کا گذر ہوگیا ہے تو چند آنے پیسوں کا خون کر کے اس ولایت کے کاروبار کا اگر ایک قیمتی تجربہ وہ بھی خرید لیں گے تو گو بظاہر وہ اپنے کو گھاٹے میں سمجھیں مگر حقیقت میں ان شاء اللہ گھاٹے میں نہ رہیں گے۔

ایک فقیر بوریا نشین نے پورے چالیس برس تک فکر و تدبر قرآن کے غار حرا میں معتکف رہ کے یہ منتشر اوراق لکھے اور پھر ان کو چند ایسے دلشفتہ جانوں کی امانت میں چھوڑ کر اس دنیا سے چلا گیا جن کے پاس نہ علم ہے، نہ روپیہ، صرف حیات چند روزہ کے ایام و سنین ہیں، اے کاش ان کی صرف اتنی ہی قیمت، اس دنیا کے بازار میں لگ جاتی کہ وہ اس امانت کا حق ادا کر سکیں۔

یہ چند سطریں معلوم نہیں کس تاثر میں زبان قلم سے نکل گئی ہیں ورنہ حتی الوسع دل کو تمنا سے اور زبان کو حرف شکایت سے آلودہ کرنے کی عادت نہیں ہے۔ حافظ کے اس شعر نے بارہا تسلی دی ہے۔ آج قارئین بھی سن لیں۔

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن
کہ دوست خود روش بندہ پروری داند

◆

معارف قرآن

تفسیر سورۂ تحریم

(۳)

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

آیت ۱ - ۲ کا شان نزول

۸۔ عورتیں اپنے ضعف و ذکاوت حس کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض کھانے کی چیزیں ناپسند کرتی ہیں۔ یہ عام نسوانی فطرت امہات المومنین میں بھی موجود تھی۔ ان میں سے کسی کسی کو بعض چیزیں طبعاً نامرغوب تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کو شہد (جیسا کہ روایات میں وارد ہے) ناپسند رہا ہو۔ بالخصوص شہد کی بعض قسمیں اپنی بو اور مزے کی تلخی کی وجہ سے ایسی ہوتی بھی ہیں کہ ہر شخص ان کو پسند نہیں کر سکتا۔ آنحضرت صلعم کو شہد بہت مرغوب تھا لیکن جب آپ کو معلوم ہوا کہ آپ کی ازواج میں سے بعض کو ناپسند ہے تو آپ نے ترک فرمادیا۔ اور اس کے اسباب مندرجہ ذیل تھے۔

الف۔ آپ میں غایت درجہ ایثار کا جذبہ تھا۔

ب۔ کمزوروں بالخصوص عورتوں اور یتیموں کے معاملہ میں آپ غایت درجہ مہربان تھے۔

ج۔ آپ بالطبع عمدہ اور طیب چیزوں کو پسند فرماتے تھے اور کریہہ الرائحہ اور ناگوار چیزوں کو ناپسند فرماتے تھے۔ نیز یہ چیز آپ کے دین میں حلت و حرمت کی علامات میں سے تھی اس لئے

اپنی ازواج کی دلداری کے طور پر آپ نے شہد کھانا ترک فرما دیا۔

علاوہ ازیں بعض اور اسباب بھی اس کے محرک ہوئے۔ جب صحابہؓ کو آپ کے اس ارادہ کا حال معلوم ہوا تو آپ کی پیروی میں انھوں نے بھی شہد کا استعمال ترک کر دیا ہوگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سب لوگوں کو حکم دیا کہ اپنا یہ عہد توڑ ڈالیں۔ "اور نقض قسم" کی گرانی، جو ایسی حالت میں قدرۃً ہر طبیعت محسوس کرتی، اس کا ازالہ یہ کہکر فرما دیا کہ" والله مولٰكم اور اللہ تمھارا مالک ہے۔

یہ واقعہ کا سیدھا سادا بیان ہوا۔ اب دیکھو اس کے لپیٹ میں بہت سی حکیمانہ تعلیمات بیان ہو گئی ہیں۔ مثلاً

۱- بیویوں کی دلداری ایک محمود کیرکٹر ہے الا آنکہ یہ کسی دینی نقصان تک متعدی ہو۔ سورہ لقمان میں بھی ہم کو یہی تعلیم ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ حسن سلوک و اطاعت کی نصیحت فرمائی لیکن ساتھ ہی ایسی باتوں میں ان کی اطاعت سے روک دیا جو خدا کی نافرمانی کا باعث ہوں۔ پس اسی اصول کے مطابق یہاں بھی رضا جوئی اور دلداری کو اصل قرار دیا اور اس کی ممانعت اسی شکل میں فرمائی جب اس سے کسی دینی ضرر کا اندیشہ ہو۔

۲- دوسری یہ کہ اگر آدمی خدا کے حکم کے خلاف کوئی قسم کھا بیٹھے تو اس قسم کا توڑنا واجب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی عہد اس وقت تک عہد نہیں ہے جب تک عبد و معبود دونوں کی رضا کی بنیاد پر وہ قائم نہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ جو عہد خدا کی رضا کے لئے نہیں بلکہ اس کی نافرمانی کے لئے ہے وہ عہد اس وصف سے بالکل محروم ہوتا ہے۔ آنحضرت صلعم کے ارشادات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

۳- اس میں رہبانیت کی نہایت واضح لفظوں میں تردید ہو گئی ہے جیسا کہ ہم پہلی اور چوتھی فصل میں بیان کر چکے ہیں۔

۴- اس امت کے لئے اللہ تعالیٰ کی جو مخصوص مہربانی اور بعثت محمدی کے ذریعہ تکمیل دین کا

جو مخصوص اہتمام ہے وہ بھی اس سے پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ جو معاملات بظاہر نہایت معمولی نظر آتے ہیں وہ بھی احتساب کی گرفت سے نہیں بچتے تاکہ ہم پر یہ بات اچھی طرح روشن رہے کہ جو باتیں ہماری نگاہوں میں معمولی ہوتی ہیں، بسا اوقات اپنے نتائج کے اعتبار سے نہایت خوفناک ہوتی ہیں۔

۵۔ شریعت کے تمام احکام علم و حکمت پر مبنی ہیں۔

۶۔ تحریم و تحلیل کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اس باب میں جو لوگ بدعت کے مرتکب ہوئے ان کو نہایت سخت الفاظ میں بعض جگہ سرزنش فرمائی ہے۔ ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب هذا حلال وهذا حرام لتفتروا على الله الكذب ان الذين يفترون على الله الكذب لا يفلحون ہر چند کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کو حرام نہیں کیا تھا، لیکن آپ کا اور آپ کے صحابہؓ کا فعل بعد والوں کے لئے نمونہ ہو سکتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس سے روک دیا۔ اور یہی باعث تھا کہ آنحضرت صلعم نے تہجد کی نماز جماعت کے ساتھ ترک فرما دی۔ اس کی تفصیل اتخذوا احبارهم و رهبانهم اربابا من دون الله کی تفسیر کے ذیل میں ملے گی۔ اور کچھ حصہ سورہ انعام میں بھی ملے گا۔ اس سے معلوم ہوگا کہ بدعت شرک اور کفر کا ایک شعبہ ہے۔

یہ وہ بنیادی تعلیمات ہیں جو ان آیات پر تدبر سے حاصل ہوتی ہیں۔ باقی اس امر کی کرید کہ وہ کیا شے تھی جو آنحضرت صلعم نے ترک فرمائی تھی، ایک ایسی بات ہے جس میں وقت ضائع کرنا بالکل فضول ہے۔ جس چیز کا ذکر اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا اس کے کھوج میں پڑنے سے کیا حاصل۔؟

ابتدا کی دو آیتوں کا شان نزول یہ ہے۔ باقی رہیں اس کے بعد کی آیات تو ان کا تعلق دوسرے واقعہ سے ہے اور اب ہم ان کے شان نزول کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

آیات ۳-۵ کا شان نزول

۹۔ آیت (واذ اسر النبی ــــــ ابکارا) میں ایک دوسرے مگر پہلے سے بالکل ملتے جلتے

ہوئے واقعہ کا بیان ہوا ہے اور اس کے بعد بالعموم مماثل واقعات ہی کا بیان ہوتا ہے۔ پہلے آنحضرتؐ کے خلق عظیم کا وہ پہلو بیان کیا جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ ازواج مطہرات کی غایت درجہ دلداری فرماتے تھے۔ پھر اسی سے ملتے جلتے ایک دوسرے پہلو کو بے نقاب کیا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان کو اپنا محرم اسرار بھی بناتے تھے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ میاں بیوی کے باہمی فرائض محبت میں سب سے زیادہ نمایاں جگہ اسی چیز کو حاصل ہے۔ اگر ایک شخص اپنی بیوی سے اپنے رازوں کو چھپاتا ہے تو اس نے اس کا درجہ بہت گرا دیا گویا میاں بیوی کے فطری تعلق کو وہ صرف ایک حیوانی خواہش کی تشفی کا ذریعہ سمجھتا ہے اور بس۔

پھر اسی ذیل میں اللہ تعالیٰ نے اس رازداری کا ذکر فرمایا جس کی ذمہ داری عورت پر ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ فالصلحت قانتات حفظت للغیب بما حفظ اللہ۔ (پس نیکوکار عورتیں فرمانبردار اور غیب کی حفاظت کرنیوالی ہیں بوجہ اس کے اللہ نے اس کی حفاظت کی) اس آیت پر غور کرو حفظ غیب اور رازداری کا رتبہ اس قدر بلند ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے صفات میں سے گنایا ہے۔ اور اسی صفت کی بنا پر اسکا نام ستار ہے۔

پھر اس سے ہم کو ایک اور اعلیٰ تعلیم بھی ملتی ہے کہ ملامت و نصیحت میں (بالخصوص بیویوں کے معاملہ میں) سخت گیری و تشدد کا طریقہ نہیں اختیار کرنا چاہیے، نرمی اور رفق کا انداز اختیار کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس معاملہ میں یہاں آنحضرت صلعم کا جو اخلاق بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے پوری بات نہیں ذکر کی۔ صرف اس کی طرف ایک اشارہ فرمادیا کہ تفصیل موجب وحشت و تکلیف نہ ہو۔

علاوہ ازیں اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ سوکنوں میں محبت، جو عورت کی سب سے اعلیٰ مگر کمیاب صفت ہے، آنحضرت صلعم کی ازواج مطہرات میں بالعموم اور ام المومنین حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہ (رحمہا اللہ) میں، بوجہ ان کی کمال عقل و طہارت نفس کے، پورے طور پر موجود تھی۔

چنانچہ یہ باہمی محبت ہی تھی جس نے آپس میں رازداری کے تمام پردے ہٹا دیئے تھے اور ایک نے دوسرے سے راز کی بات بے تکلف ظاہر کردی جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو تنبیہ فرمائی۔ اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ لغزش جو بربنائے محبت و اخلاص صادر ہوئی باعتبار اپنے منشاء کے بہت سی نیکیوں پر فضیلت کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی طرح کی لغزش حضرت نوح علیہ السلام سے اپنے بیٹے کیلئے استغفار کے معاملہ میں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنے باپ کے معاملہ میں ہوئی جو درحقیقت اس رافت و محبت کا مظہر تھی جو محمود ہے۔ پس حقیقت کے اعتبار سے یہ فعل رہبانیت سے مشابہت رکھتا ہے جو ایک خلق حسن سے وجود میں آتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے جس طرح اس چیز کی علت کا حکم دیا جو بربنائے تشدد حرام کرلی گئی ہو اسی طرح اس چیز کی حرمت کا بھی حکم دیا جو بربنائے مسامحت و لینت حلال کر دی گئی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارا دین کس طرح نرمی و سختی کے درمیان ایک نقطۂ اعتدال ہے اور وہ کس صحت و اہتمام کے ساتھ ہر چیز کو اس کی اصل جگہ میں دیکھنا چاہتا ہے۔

اس کے بعد حضرت عائشہ و حفصہ (رضی اللہ عنہما) کی توبہ و انابت کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کی پوری تفصیل ہم ایک مستقل فصل میں صُغت قلوبکما کی تفسیر کے سلسلہ میں بیان کریں گے۔

جنگ کے بعد صلح اور آزردگی کے بعد ملاپ کی لذتوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے! یہی سچی اور حقیقی توبہ ہے۔ اس کی تفصیل آل عمران کی آیت ۱۳۲ - ۱۳۵ میں ملے گی جہاں اللہ تعالیٰ نے توبہ کرنیوالوں کی تعریف فرمائی ہے اس سے اندازہ کر سکو گے کہ توبہ کا رتبہ کس قدر بلند ہے۔

پھر ان سب کے بعد ایک اور عظیم حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ کہ زوجین کے فرائض میں سے باہمی مودت و موانست بھی ایک اہم ترین فریضہ ہے۔ آیت وان تظٰہرا علیہ فان اللہ ہو مولٰہ وجبریل (اگر وہ دونوں اس کے خلاف ایکا کرینگی تو اللہ اس کا مولیٰ ہے اور جبریل) سے جس صورت حالات کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ ہو رہا ہے احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

ہم اس کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ پیش کرنا چاہتے ہیں۔

آنحضرت صلعم کے متعلق یہ بات معلوم ہے کہ جس طرح آپ اپنے صحابہؓ کے ساتھ تمام چھوٹے بڑے کاموں میں شریک ہوتے تھے اسی طرح گھر کے کام کاج میں اپنی ازواج مطہرات کا بھی ہاتھ بٹاتے تھے اور اس خلق نبوی نے قدرۃً باہمدگر انس و محبت کی ایک ایسی حالت پیدا کر دی تھی جس کو زیادہ سے زیادہ اعتمادی حالت کہا جا سکتا ہے اس باہمی اعتماد کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب آنحضرت صلعم نے افشائے راز پر کچھ قدر ناخوشی کا اظہار فرمایا اور کچھ کھنچے کھنچے سے ظاہر ہوئے تو ان دونوں بی بیوں پر یہ بات شاق گذری اور ان میں ایک طرح کا جذبہ غیرت و حمیت بھڑک اٹھا۔ ہر چند کہ یہ جذبہ ہر محل و مقام میں محمود نہیں لیکن باعزت و شریف طبائع کے اندر یہ ایسا فطری جذبہ ہے کہ ایسے مواقع پر اس کا دبا رہنا نہایت ہی مشکل ہے۔ پس جیسا کہ میاں بیوی کی باہمی زندگی میں عام طور پر ہوتا ہے یہ دونوں بیویاں بھی آپ سے روٹھ گئیں انھوں نے خیال کیا کہ یہ اپنے نجی تعلقات کا ایک معاملہ ہے جس میں انکو اپنی خودداری کے اظہار کا پورا حق ہے۔ اسکو دین سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

اس موقع پر مناسب ہوگا اگر ہم اس غیرت و خودداری کو بھی یاد رکھیں جو عرب کی فطرت کا خاص جوہر تھی اور جسکی وجہ سے ان کیلئے کسی کی اطاعت سے زیادہ دشوار بات کوئی اور بات نہ تھی جس نے ایک جذبہ کی حد سے گزر کر ان کی طبیعت ثانیہ کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور ان کے اکثر اخلاقی محاسن کا سرچشمہ تھی۔

پس اللہ تعالیٰ نے ان کو نصیحت فرمائی کہ پیغمبر کی دلبستگی تمہارے ساتھ ایک بالکل مختلف حالت رکھتی ہے۔ یہ اس کی طرف سے سراسر شفقت و مہربانی ہے۔ اس کے لئے اللہ کا رشتہ کیا کم ہے کہ وہ کسی اور رشتہ میں طمانیت ڈھونڈھے۔ اس کی مجلس ہر وقت روح القدس، مومنین صالحین اور ملائکہ سے معمور ہے۔ پس تم اگر اس سے روٹھ جاؤ تو اس سے تمہارے ہی دل اجڑ جائیں گے اس کی بزم کی رونق پھیکی نہیں پڑ سکتی۔ اور پھر واضح لفظوں میں بتا دیا کہ کسی امر معروف میں پیغمبر سے اعراض درحقیقت امر الٰہی سے اعراض کے ہم معنی ہے اس لئے ضرور ہے کہ تم توبہ کرو۔

پھر پانچویں آیت نے اس دینی شرف و تقویٰ سے تعرض کیا ہے، جس کا احساس ان دونوں بیویوں کو ہو سکتا تھا۔ اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کے اہل بیت خود چنے ہیں اور اپنے فضل و حکمت سے ان کو عمدہ اخلاق سے آراستہ فرمایا ہے چنانچہ فرمایا ہے۔ الطیبٰت للطیبین والطیبون للطیبٰت۔ نیز فرمایا ہے۔ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھرکم تطھیراً۔ پس ان کو حق نہیں ہے کہ اپنے فضائل پر فخر کریں۔ یہ روشنی جو ان کو حاصل ہے نبیؐ کے فیض صحبت سے حاصل ہے۔ اگر پیغمبرؐ ان کو چھوڑ دے اور اپنے لئے دوسری بیویاں پسند کرے تو بہت ممکن ہے کہ وہ اپنے اخلاق و فضائل میں ان سے برتر ہوں۔ پس ضروری ہے کہ وہ اپنے اس دینی فضیلت کے سرچشمہ کو سمجھیں اور اس کی اطاعت و محبت کے لئے ان کے دل جھک جائیں اور یہ ایک ایسی چیز ہے جو ان کے لئے بیگانہ نہیں ہے۔ اس کی تڑپ خود ان کے اندر موجود ہے۔ کیونکہ محبت کا اصل مصدر در حقیقت حیا ہے۔ اور وہ غیرت و حمیت جو میاں بیوی کے درمیان ابھرتی ہے اس میں خفگی اور بے پروائی محض اوپر کا پردہ ہے۔ اسکے باطن میں محبت کی بے قراریوں کے چشمے ابلتے ہیں۔ ہمارے نزدیک معاملہ کی اصل حقیقت یہی تھی۔ بارھویں فصل میں ہم نے انکو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

ہر چند کہ اس واقعہ کا تعلق صرف دو ہی بیویوں سے تھا لیکن اس آیت میں، جسمیں تنبیہ فرمائی گئی ہے، صیغہ جمع کا استعمال ہوا ہے تاکہ ایک طرف نصیحت میں عموم کا پہلو پیدا ہو اور دوسری طرف سرزنش کی شدت کچھ ہلکی ہو جائے۔

اس واقعہ سے بھی ہم کو بہت سے ایسے سبق حاصل ہوتے ہیں جو خانگی زندگی کی اصلاح کی بنیاد ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیویوں کے ساتھ حسن سلوک اصل چیز ہے مگر احتساب سے غافل نہ ہونا چاہیے۔ تدبیر منزل، جو تمدنی زندگی کی بنیاد ہے، اس کی معتدل راہ یہی ہے۔ خانگی زندگی کا بگاڑ اور میاں بیوی کے تعلقات کی خرابی ملک کی خرابی کا پیش خیمہ ہے۔ اس سے ان قوانین کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے جو خانگی زندگی

کی اصلاح و درستگی کے لئے اسلام نے بنائے ہیں۔ اب ہم سورہ کے شان نزول پر اس پہلو سے غور کرتے ہیں۔

آیات (۱ - ۵) کا شان نزول

ایک کلی حقیقت

۱۰۔ اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ اسلام یہودیت کی سختی اور نصرانیت کی نرمی کے بین بین ہے۔ یہ کلی حقیقت اس درجہ اعتدال کے سمجھنے کی طرف رہبری کرتی ہے جو اسلام نے ہماری شریعت کے اکثر جزئیات میں ملحوظ رکھی ہے۔ یہاں ہم اس معاملہ کے اتنے حصہ پر غور کرنا چاہتے ہیں جتنا مذکورہ واقعہ سے متعلق ہے۔

یہ قطعی ہے کہ یہود کی شریعت اور اس کے تمام قوانین و احکام عورتوں کے لئے نہایت سخت اور معاشرتی میزان میں ان کے رتبہ کو ہلکا کرنے والے تھے۔ اس کے بالکل برعکس نصاریٰ نے، جیسا ہم اپنی کتاب الناسخ والمنسوخ میں بیان کر چکے ہیں، عورتوں کے باب میں انتہائی نرمی کی راہ اختیار کی۔ یہ دونوں راہیں افراط و تفریط کی راہیں تھیں جو اکثر ایک ہی نتیجہ تک رہبری کرتی ہیں۔ بھلائی اور بہتری کی راہ صرف اعتدال اور میانہ روی کی راہ ہے۔

ان معاملات میں عربوں کا رجحان اس سے بالکل مختلف راہ پر پڑ چکا تھا۔ وہاں حقوق کے بارہ میں ایک مستقل کشمکش اور آویزش جاری تھی۔ عورت اور مرد دونوں زیادہ سے زیادہ حقوق حاصل کر لینا چاہتے تھے۔ اور چونکہ شرافت و حمیت عرب کے خون کا اصل جوہر تھا جس کی وجہ سے کمزوروں کو دبانا وہ خلاف شان سمجھتے تھے، اس لئے عورتوں کو اپنی طبعی کمزوری کے باوجود موقع تھا کہ اس طلب حقوق کی جنگ میں ان سے نبرد آزمائی کر سکیں۔ اس کا نتیجہ تھا کہ وہاں کوئی متوازن حالت قائم نہیں تھی۔

ایک مستمر کشاکش کی حالت تھی جس میں کبھی مرد فتحیاب ہوتے تھے کبھی عورت جن لوگوں نے جاہلیت کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کیا ہے وہ اس امر واقعہ کا انکار نہیں کرسکتے۔ امراء القیس عورتوں کے بارہ میں کہتا ہے۔

وانک لم یفخر علیک کفاخر ضعیف ولم یغلبک مثل مغلب

ایک کمزور فخر کرنیوالے سے زیادہ تمہارے مقابلہ میں کوئی فخر نہیں کرسکتا اور ایک بارہا رکے شکست
خوردہ سے زیادہ تمہارے اوپر کسی کا غلبہ سخت نہیں ہوسکتا۔

اس میں امراء القیس نے عورتوں کے لئے مغلّب (جس نے بار بار شکست کھائی ہو) کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے اُس جنگ و نزاع کی طرف اشارہ ہو رہا ہے جو عورتوں اور مردوں کے درمیان برپا تھی۔

مکہ میں قریش کا یہی حال تھا۔ وہ عرب کی اصلی طبیعت کے نمایندے تھے۔ ان کے ہاں عورت کا رتبہ بین بین تھا۔ اور جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کبھی کبھی حالت غیر متوازن بھی ہو جاتی تھی۔ لیکن جب یہ لوگ یثرب (مدینہ) پہنچے تو وہاں یہ حالت یکسر منقلب ہوگئی۔ وہاں یہود و نصاری بکثرت آباد تھے۔ ان میں سے بہت سے نصاری اسلام لائے اور ان کی عورتوں کا میل مسلمان عورتوں سے ہوا۔ اس میل نے قریش کی عورتوں پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔ حضرت ابن عباسؓ حضرت عمر بن الخطابؓ سے اسی واقعہ کے سلسلہ میں روایت کرتے ہیں کہ "ہم قریش کے لوگوں کا حال یہ تھا کہ مرد عورتوں پر غالب تھے لیکن جب ہم مدینہ آئے تو ہم نے یہاں کے لوگوں کو دیکھا کہ ان کی عورتیں ان کے مردوں پر غالب ہیں۔ ان عورتوں کے ساتھ جب ہماری عورتوں کا میل جول ہوا تو ہماری عورتیں بھی مردوں کے مقابلہ میں دلیر ہوگئیں۔"

یہ حالت متقاضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ عورتوں کے حقوق اور ان کے فرائض دونوں تفصیل کے ساتھ بیان فرمادے۔ اس طرح تدبیر منزل سے متعلق بیشتر بنیادی قوانین کے نزول کے لئے بہترین سازگار ساعت تقدیر الٰہی سے ظہور میں آگئی۔ چنانچہ سورہ نساء نازل ہوئی جس میں میراث و نکاح وغیرہ کے

احکام بیان ہوئے ، وہ جو عورتوں کا درجہ متعین کرنے میں ایک قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح عورتوں سے متعلق بعض احکام سورہ بقرہ میں نازل ہوئے جن کی رو سے عورتوں کو بعض ایسے بنیادی حقوق حاصل ہوئے جو اختلاف و نزاع کے وقت ان کے حقوق و فرائض کی تعیین میں رہنمائی کا کام دے سکیں اور ناانصافی و حق تلفی کے مواقع باقی نہ رہیں۔ یہی وہ اصلی مصلحت ہے جو تشریح کی تفصیل کی مقتضی ہوئی ہے۔ نصاریٰ کی گمراہی کی ایک وجہ ان کی شریعت کا اجمال و ابہام ہے۔ اجمال اسی وقت تک موزوں ہوتا ہے جب تک قوم کے حالات و اخلاق درست ہوں، مگر جب اخلاق بگڑ جاتے ہیں تفصیل ناگزیر ہو جاتی ہے اور ایسی تفصیل جو بدلنے والے حالات کا ساتھ دے سکے۔

علاوہ ازیں سورہ نور نازل ہوئی جو وسط قرآن میں ہے اور سورہ نساء اور احزاب دونوں کناروں پر ہیں۔ پھر اس سورہ میں بھی جس کا نزول ایک خاص واقعہ کے لئے مقدر تھا، اللہ تعالیٰ نے ہم کو وہ تمام ذمہ داریاں بتائیں جو ہمارے اہل و عیال سے متعلق ہمارے اوپر عاید ہوتی ہیں اور جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ ہم کو احتساب کی سخت گیری کے ساتھ ساتھ احسان اور رفق و ملاطفت کی تعلیم فرمائی اور ان تمام تفصیلات نے عورتوں سے متعلق حقوق و فرائض کے تمام گوشوں کو اس طرح واضح کر دیا کہ کوئی بات ہمارے لئے مبہم و مجمل نہیں رہ گئی جیسا کہ نصاریٰ کے ہاں مجمل ہے کہ وہ اس امر کا فیصلہ نہیں کر سکتے کہ عورتوں کو ان پر اختیار حاصل ہے یا ان کو عورتوں پر اختیار حاصل ہے۔ ہم "الرجال قوامون علی النساء" کی تفسیر میں اس امر کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔

پھر یہاں ایک اور امر قابل غور ہے۔ یہ سورہ اپنی ماقبل سورہ کے ساتھ احکام کی آخری سورہ ہے اور بقرہ احکام کی اولین سورہ ہے۔ پھر سورہ نور وسط میں ہے اور نساء اور احزاب دونوں کناروں پر ہیں۔ اس سے اس اہتمام کا اندازہ ہوتا ہے جو قرآن نے عورتوں کے حقوق اور ان کی اصلاح کے معاملہ میں اختیار کیا ہے اور یہ اہتمام اس دین کامل کی خصوصیات میں سے ہے۔

اور ایک بنیادی حقیقت جو سورہ نساء میں پوری وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے اور جس کی طرف اس سورہ میں اور قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی اشارہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ ان معاملات سے متعلق تمام قوانین و احکام کی بنا اس امر پر ہے کہ ہم سب ایک ہی نفس کے اجزاء ہیں پس اگر ہم اپنے حالات کی ٹھیک ٹھیک اصلاح کرلیں تو ہم گویا ایک جسم و جان کی طرح ہوجائیں گے۔ اس اعتبار سے مردوں کا اقتدار عورتوں پر کوئی ظلم و تعدی اور قہر و جبر نہیں ہے بلکہ یہ ایک دوسرے کی اسی طرح خدمت و اعانت ہے جس طرح ایک جسم کے مختلف اعضا باہمدگر کرتے ہیں۔ اس نکتہ کی پوری تفصیل "خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منہا زوجہا" کی تفسیر کے ذیل ہم کر چکے ہیں۔ یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

(باقی)

تفسیر سورہ فیل

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی تفسیر سورہ فیل کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کی ہر فصل ایک مستقل کتاب ہے اور واقعہ فیل کی اصل حقیقت اس کتاب کی اشاعت سے پہلے بالکل مجہول تھی۔ علامہ فراہیؒ نے کلام عرب کی مدد سے واقعہ کی تمام تفصیلات فراہم کرکے تمام تاریخی غلطیوں کو بے نقاب کردیا ہے۔ واقعہ طیر کو بھی عجائب پرستی نے بالکل دوسرا رنگ دیدیا تھا۔ مولانا نے اس کے متعلق بھی عینی شاہدوں کی شہادتیں جمع کرکے اس کی اصل حقیقت آشکارا کردی ہے اور اسی سلسلہ میں رمی جمرات اور حج کے دوسرے مراسم کے اسرار و حکم نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ عمدہ

حجم ۱۱۳ صفحے۔ قیمت:- ۸ر آٹھ آنے۔

منیجر

ذبیح کون ہے؟

(۱۳)

ابن جریر رحمہ اللہ کے دلائل

-- ابن جریر رحمہ اللہ فریقین کے اقوال و روایات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"قرآن کی دلالت، جس کے متعلق ہم نے کہا ہے کہ وہ حضرت اسحٰق ؑ کے ذبیح ہونے کو متعلق ہے، ہمارے نزدیک زیادہ قرین صواب ہے۔ جس وقت حضرت ابراہیم ؑ نے اپنی قوم کو چھوڑ کر اپنی بیوی سارہ کے ساتھ شام کی طرف ہجرت فرمائی ہے ان کی اسوقت کی دعا قرآن نے ان الفاظ میں نقل کی ہے۔ قال انی ذاھب الیٰ ربی سیھدین۔ رب ھب لی من الصالحین۔ (کہا میں اپنے پروردگار کی طرف جاؤں گا وہ میری رہبری فرمائے گا۔ پروردگار مجھے صالح اولاد بخش) اور یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ نہ تو حضرت ابراہیم ؑ ہاجرہ سے آشنا ہیں اور نہ وہ حضرت اسمٰعیل ؑ کی ماں ہوئی ہیں۔ پھر اسی سے متصل اللہ تعالیٰ نے اس قبولیت کا ذکر فرمایا ہے جو ان کی دعا کو حاصل ہوئی اور ان کو ایک بردبار بیٹے کی ولادت کی خوشخبری دی۔ پھر ان کے رویا کا ذکر فرمایا کہ جب وہ بیٹا ان کے ساتھ دوڑنے پھرنے کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو وہ اس کو ذبح کر رہے ہیں۔"

یہ ابن جریر رحمہ اللہ کی پہلی دلیل ہے، اس کے بعد وہ اسی سے متصل اپنی دوسری دلیل بیان کرتے ہیں۔

"قرآن میں اللہ تعالیٰ نے نام لیکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اگر کسی بیٹے کی بشارت دی ہے تو وہ حضرت اسحٰق ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔ وامرأته قائمة فضحكت فبشرناها باسحٰق ومن وراء اسحٰق یعقوب (اور اس کی بیوی کھڑی تھی پس وہ ہنسی پس ہم نے اسحٰق کی خوشخبری دی اور اسحاق سے یعقوب کی)، دوسری جگہ ہے۔ فاوجس منهم خیفة قالوا لا تخف وبشروه بغلام علیم۔ فاقبلت امرأته فی صرة فصكت وجهها وقالت عجوز عقیم۔ اسی طرح جہاں کہیں بھی حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی خوشخبری دی ہے تو وہ خوشخبری ان کی زوجہ سارہ کے بطن سے بیٹے کی ولادت کی ہے۔ پس ضروری ہے کہ قرآن مجید کے دوسرے نظائر پر قیاس کرکے فبشرناہ بغلام حلیم میں بھی بشارت کا تعلق اسی بیٹے سے سمجھا جائے جو سارہ کے بطن سے پیدا ہوا۔"

یہ علامہ ابن جریر رحمہ اللہ کی دوسری دلیل ہے۔ پھر اسی سے متصل انھوں نے مخالفین کے بعض اقوال کی تردید کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

"بعض لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ جبکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاق کی ولادت کی خوشخبری کے ساتھ ساتھ حضرت یعقوب کی خوشخبری بھی پہلے سے دیدی تو یہ بات اس بات سے مانع ہے کہ وہ اس کے ذبح کا حکم دیدے۔ لیکن یہ اعتراض ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے حضرت اسحٰقؑ کے ذبح کا حکم اسوقت ہوا ہے جبکہ حضرت اسحٰقؑ باپ کے ساتھ دوڑنے پھرنے کی عمر کو پہنچ چکے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت یعقوب کی ولادت ذبح کے حکم سے پہلے ہو چکی ہو۔ اسی طرح جو لوگ اس سے دلیل پکڑتے ہیں کہ انھوں نے مینڈھے کے سینگ کعبہ میں لٹکے ہوئے دیکھے تو یہ بات بھی کچھ قوت نہیں رکھتی کیونکہ یہ کچھ محال نہیں ہے کہ سینگ شام سے لاکر کعبہ میں لٹکا دیئے جائیں۔"

یہ علامہ ابن جریر رحمہ اللہ کے استدلال کا خلاصہ ہے جو ہم نے ان کے لفظوں میں پیش کر دیا ہے اب ہم اس استدلال کی قوت پر ناقدانہ غور کرنا چاہتے ہیں

ابن جریر رحمہ اللہ کے دلائل پر تنقید

۵ -- اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ابن جریر رحمہ اللہ نے حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کی دو دلیلیں بیان کی ہیں۔ اور ساتھ ہی دو اعتراضوں کے جوابات دیے ہیں ۔ یہ سب چار باتیں ہوئیں اب ہم ان چاروں پر بالترتیب نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

۱۔ علامہ ابن جریر رحمہ اللہ نے پہلی دلیل دعا اور بشارت کے اتصال سے پیدا کی ہے ۔ انکا خیال ہے کہ چونکہ بیٹے کے لئے ابراہیمؑ نے دعا اس وقت کی ہے جبکہ ہاجرہ سے ابھی واقف بھی نہیں ہوئے ہیں اس لئے لازماً یہ دعا سارہؑ سے اولاد کے لئے تھی اور چونکہ بیٹے کی بشارت دعا کے ذکر سے بالکل متصل ہے اس لئے ناگزیر ہے کہ یہ بشارت حضرت سارہؑ کے بطن سے بیٹے کی ولادت کی ہو۔

لیکن ہمارے نزدیک یہ استدلال صحیح نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کا حضرت ہاجرہ سے ناآشنا ہونا اس امر کو مستلزم نہیں کہ ان کی دعا حضرت سارہؑ سے اولاد کے لئے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے بغیر کسی تعیین و تشخیص کے اولاد کے لئے عام دعا کی ہو۔ اور یہ تو حضرت ابراہیمؑ کے لئے کچھ زیبا بھی نہیں کہ وہ دعا میں ایک متعین صورت اللہ تعالیٰ کے سامنے تجویز کریں اور مخصوص طور پر حضرت سارہؑ کے بطن سے اولاد کی تمنا کریں۔

ہمارے اس خیال کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ہاجرہؑ کو اولاد دی تو اس کو انھوں نے اپنی دعا کی قبولیت سمجھکر اس کا نام اسمٰعیل (یعنی اللہ نے اس کی دعا سنی) رکھا۔ جیسا کہ خود قرآن کے اشارات سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ الحمد للہ الذی

وھب لی علی الکبر اسمٰعیل واسحق ان ربی لسمیع الدعاء (اس خدا کے لئے شکر ہے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحق بخشے، بے شک میرا پروردگار دعا کا سننے والا ہے) اگر کوئی دعا خاص طور پر حضرت سارہؑ کے بطن سے اولاد کے لئے ہوتی تو لازمًا وہ یہ نام (اسمٰعیلؑ) حضرت اسحق کا رکھتے۔

بہرحال علامہ ابن جریر رحمہ اللہ کا یہ استدلال غلط ہے اور اس استدلال کی غلطی واضح ہونے کے بعد وہ استدلال اپنی جگہ پر پھر قائم ہوجاتا ہے کہ دعا اور بشارت کا اتصال اس امر کا ثبوت ہے کہ جس بیٹے کا ذکر دعا سے متصل ہوا ہے اس سے مراد وہی بیٹا ہے جو پہلے پیدا ہوا جیسا کہ ہم نویں فصل میں اور اس کے بعد کی فصلوں میں بیان کر چکے ہیں اور جیسا کہ فصل ۳۲ کی دوسری روایت میں ہم دیکھ چکے ہیں یہی محمد بن کعب قرظیؒ کی دلیل ہے جو آیات قرآن کی بنا پر انھوں نے قائم کی ہے۔

۲- علامہ ابن جریرؒ کی دوسری دلیل نظائر کی بنا پر ہے۔ حضرت ابراہیم کے لئے بیٹے کی جتنی بشارتیں اس مقام کے علاوہ مذکور ہیں سب حضرت اسحاقؑ کے لئے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ یہ بشارت بھی ان ہی سے متعلق ہو۔

لیکن ہمارے نزدیک یہ بات کسی حیثیت سے بھی ضروری نہیں۔ کسی ایک بات کا متعدد مقامات میں بیان ہونا اس امر کو مستلزم نہیں کہ ایک دوسری بات ایک دوسرے مقام میں نہ بیان کی جائے۔ اور پھر نظائر کی بنا پر جو دلیل قائم ہوتی ہے اس سے زیادہ سے زیادہ ایک احتمال قائم ہوتا ہے بشرطیکہ کوئی دوسری نظیر یا دلیل اس کے مخالف نہ پڑے اور یہاں معلوم ہے کہ بہت سے نظائر اور دلائل اس کے خلاف ہیں۔ جیسا کہ تفصیل کے ساتھ پچھلی فصلوں میں بیان کر آئے ہیں۔ از انجملہ ایک نہایت کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ حضرت اسحاق کی بشارت پورے قرآن میں، کہیں بھی نہ تو واقعہ ذبح کے بیان کے ساتھ لگی ہوئی مذکور ہے اور نہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا سے متصل۔ پس یہ بشارت ان تمام بشارتوں سے ایک بالکل مختلف حالت رکھتی ہے جو حضرت اسحٰقؑ

کے بارہ میں وارد ہیں۔ پھر موقع زیر بحث میں حضرت اسحٰق علیہ السلام کی بشارت کا اس کے بعد آنا اس امر کا نہایت قوی ثبوت ہے کہ پہلی بشارت دوسری بشارت سے بالکل مختلف ہے۔ پس علامہ ابن جریرؒ نے نظیر کی بنا پر جو دلیل قائم کی، اس سے زیادہ قوی نظیر اس کی مخالفت کر رہی ہے۔

۳۔ جو لوگ اس بنا پر حضرت اسحاقؑ کا ذبیح ہو ممتنع سمجھتے ہیں کہ ان کی ولادت کی بشارت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان سے حضرت یعقوب کی ولادت کی بشارت بھی دی ان کا جواب علامہ ابن جریرؒ یہ دیتے ہیں کہ "یہ ممکن ہے کہ حضرت یعقوب اسوقت سے پہلے پیدا ہو چکے ہوں جبکہ حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحاق کے ذبح کا حکم ملا" لیکن ہمارے نزدیک علامہ ابن جریرؒ کا یہ جواب صحیح تسلیم کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ کیونکہ ذبیح کا نوخیز اور کمسن ہونا تورات اور قرآن دونوں سے معلوم ہے اور اتنی بات فریقین میں متفق علیہ ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت یعقوبؑ حضرت اسحٰقؑ کے بڑھاپے میں پیدا ہوئے ہیں، یا تو حضرت ابراہیمؑ کی وفات کے بعد یا اس سے کچھ پہلے۔ ہم اس مسئلہ پر دسویں فصل میں بحث کر چکے ہیں جس کو تفصیل کی خواہش ہو اس فصل کو پڑھ لے۔ بلکہ ہمارا دعویٰ تو اس سے بھی ایک قدم آگے ہے۔ ہم نے تو یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو یہ امتحان حضرت اسحاقؑ کی ولادت سے پہلے پیش آیا اور اس کے وجوہ کی تفصیل چھٹی، گیارھویں، اور تیسویں فصل میں بیان کر چکے ہیں۔ بہرحال یہ جواب کہ حضرت اسحٰق کی قربانی حضرت یعقوب کی ولادت کے بعد ہوئی ہوگی نہایت لغو اور بے معنی ہے۔

۴۔ بعض روایات میں حضرت ابن عباسؓ وغیرہ سے مینڈھے کی سینگوں کا خانہ کعبہ میں دیکھا جانا بیان ہوا ہے۔ علامہ ابن جریر رحمہ اللہ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ "یہ ناممکن نہیں ہے کہ سینگ شام سے لا کر خانہ کعبہ میں رکھ دیئے گئے ہوں"۔ ہمارے نزدیک یہ سینگ والی روایت قابل اعتماد نہیں۔ قرآن میں اس کی تائید میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔ پس اس کا ثبوت اور

عدم ثبوت دونوں ہمارے نزدیک یکساں ہے۔ اور بہتر تھا کہ اس سے سرے سے تعرض ہی نہ کیا جاتا لیکن جب علامہ ابن جریرؒ نے اس کا جواب دینے کی کوشش کی ہے تو ضروری ہے کہ ان کے جواب کی نوعیت پر غور کیا جائے۔

ہرچند کہ امکان عقلی کا دائرہ نہایت وسیع ہے لیکن قوموں کے حالات و عادات کے اعتبار سے یہ بات نہایت مستبعد معلوم ہوتی ہے کہ کسی قوم کے قدیم آثار مقدسہ اتنی سہولت کے ساتھ اس کے پاس سے منتقل ہو کر دوسری قوم کے پاس چلے جائیں، اور وہ اس پر راضی ہو جائے۔ اس طرح کے معاملات پر دنیا میں بڑی بڑی خونریز جنگیں برپا ہو چکی ہیں اور قبل از اسلام کی تاریخ میں ہم کو کوئی ایسا واقعہ نہیں معلوم جبکہ عربوں نے یہود و نصاریٰ کو مغلوب کیا ہو کہ اس سلسلہ میں یہ مقدس یادگار ان کے ہاتھ آئی ہو۔ اگر اس طرح کا واقعہ پیش آیا ہوتا تو یقیناً یہ دونوں قوموں کی تاریخ کا سب سے زیادہ اہم اور مشہور واقعہ ہوتا اور بچہ بچہ اس کو جانتا۔ پس ہمارے نزدیک علامہ ابن جریر کی یہ بات بھی بالکل بے معنی ہے۔

تفسیر کبیر اور کشاف کے بیانات کا خلاصہ اور بعض ضروری تنبیہات

۳۶۔ امام رازی نے علامہ زمخشری کے اصول پر دونوں فریق کے دلائل بیان کر دئے ہیں۔ ہرچند کشاف کی عبارت زیادہ مختصر اور واضح ہے لیکن چونکہ امام رازی کی تفسیر شہرت و مقبولیت کے اعتبار سے زیادہ اونچی ہے اس لئے ہم نے اسی سے نقل کرنا پسند کیا۔ امام رازی ان لوگوں کے نام ذکر کرنے کے بعد جن کے طرف دونوں قول منسوب کئے گئے ہیں فرماتے ہیں۔

"جو لوگ قائل ہیں کہ ذبیح حضرت اسمٰعیل ہیں ان کے دلائل یہ ہیں۔

۱۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ انا ابن الذبیحین (میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں) اور ایک مرتبہ

ایک اعرابی نے آپ کو ابن الذبیحین کہکر مخاطب کیا تو آپ مسکرائے۔ جب اس کے متعلق سوال کیا گیا تو کہا عبد المطلب نے جب چاہ زمزہ کھودنے کا ارادہ کیا تو منت مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کام کو آسان کیا تو وہ اپنے ایک بیٹے کی قربانی کریں گے۔ جب یہ کام حسب خواہش پورا ہوگیا اور وقت آیا کہ نذر پوری کریں اور بیٹوں پر قرعہ ڈالا تو قرعہ عبد اللہ کے نام نکلا۔ لیکن ان کے ماموں نے اس معاملہ میں رکاوٹ ڈالی کہ عبد اللہ کے بدلہ سو اونٹوں کا فدیہ دیدیں چنانچہ عبد المطلب نے سو اونٹ فدیہ میں دیدیئے۔ اور دوسرے ذبیح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں۔ (ابن جریرؒ نے اس روایت کو ذکر کیا ہے اور کسی قدر اختلاف کے ساتھ ابن کثیرؒ نے بھی نقل کیا ہے لیکن اسکی سند میں ضعف کا پتہ دیا ہے۔ اگر روایت صحیح ہوتی تو یہ اس باب میں بالکل قطعی تھی کیونکہ یہ اپنے مفہوم میں بالکل صریح ہے)

۲۔ اصمعی سے روایت ہے کہ میں نے ابو عمرو بن علاء سے ذبیح کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا "اے اصمعی تمہاری عقل کہاں ہے! اسحٰق مکہ میں کب تھے! مکہ میں تو اسمٰعیلؑ تھے۔ ان ہی نے اپنے باپ کے ساتھ ملکر بیت اللہ کی تعمیر کی اور قربان گاہ مکہ میں ہے۔"

۳۔ اللہ تعالیٰ نے اسمٰعیلؑ کے صبر کی تعریف فرمائی ہے۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے لئے اس وصف کا ذکر نہیں کیا۔ واسمٰعیل والیسع وذا الکفل کل من الصابرین۔ یقیناً یہ صبر وہی صبر ہے جو ذبح کے وقت ظاہر ہوا نیز ان کی تعریف میں صادق وعدہ ہونا بھی وارد ہے انہ کان صادق الوعد اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے باپ نے ان کی طرف سے یہ وعدہ کرلیا تھا کہ وہ ذبح کے امتحان میں ثابت قدم ہوں گے اور حضرت اسمٰعیلؑ نے اس وعدہ کو سچا کردکھایا۔ (اس میں دو مستقل دلیلیں بیان ہوئی ہیں)

۴۔ قرآن مجید میں وارد ہے۔ فبشرناہ باسحٰق ومن وراء اسحٰق یعقوب۔ (پس ہم نے اس کو خوشخبری دی اسحٰق کی اور اسحٰق سے یعقوب کی) اب اگر ذبیح حضرت اسحٰق ہیں تو یا تو ان کے ذبح

کا حکم حضرت یعقوب کی ولادت سے پہلے ہوا ہے یا ان کی ولادت کے بعد۔ ولادت سے پہلے ذبح کا حکم ہونا علانیہ باطل ہے کیونکہ جب حضرت اسحٰق کی بشارت کے ساتھ ان سے یعقوب کی ولادت کی بھی بشارت دی گئی۔ تو حضرت یعقوب کی ولادت سے پہلے حضرت اسحٰقؑ کے ذبح کا حکم دینا کسی طرح جائز نہیں ورنہ اس سے اس وعدہ کی خلاف ورزی لازم آتی ہے جو من وراء اسحٰق یعقوب میں کیا گیا ہے۔ اور ولادت کے بعد ذبح کا حکم دینا یوں باطل ہے کہ قرآن مجید میں وارد ہے کہ فلما بلغ معه السعی قال یٰبنی انی اری فی المنام انی اذبحك (پس جب وہ اس کے ساتھ دوڑنے پھرنے کی عمر کو پہنچا۔ کہا اے میرے بیٹے میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں) جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیٹا جب دوڑنے پھرنے کی عمر کو پہنچا اور اس قابل ہوا کہ کچھ اپنے ہاتھوں کر دھر سکے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو اس کے ذبح کا حکم دیا۔ اور یہ بیان اس امر کے صریحاً منافی ہے کہ یہ واقعہ کسی دوسرے زمانہ میں پیش آئے۔ پس معلوم ہوا کہ حضرت اسحٰقؑ کا ذبیح ہونا کسی طرح ثابت نہیں۔ (ہر چند کہ اس بیان میں غیر ضروری اطناب ہے لیکن دلیل کا پہلو واضح ہے۔)

۵۔ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق قرآن مجید میں منقول ہے کہ انھوں نے ہجرت کے وقت فرمایا کہ انی ذاهب الی ربی سیهدین (میں اپنے پروردگار کی طرف جاؤں گا وہ میری رہبری فرمائیگا) پھر اللہ تعالیٰ سے ایک بیٹے کے لئے دعا کی جو دیار غربت میں دلبستگی کا ذریعہ ہو۔ رب هب لی من الصالحین (پروردگار مجھے صالح بیٹا بخش) یہ دعا اسی حالت میں موزوں ہو سکتی ہے جب ان کو کوئی اولاد نہ ملی ہو۔ کیونکہ اگر ایک بیٹا ان کو مل چکا ہوتا تو ایک بیٹا وہ نہ مانگتے۔ حاصل کی طلب محال ہے۔ هب لی من الصالحین ایک بیٹے کی طلب کے مفہوم کے لئے بالکل واضح ہے۔ لفظ من تبعیض کے لئے ہے اور تبعیضیت کا ادنیٰ درجہ ایک ہے۔ پس من الصالحین ایک بیٹے کی طلب کا فائدہ دیتا ہے۔ پس یہ سوال اسی حالت میں موزوں ہو سکتا ہے جب ان کے کوئی اولاد نہ ہو۔

اس سے ثابت ہوا کہ یہ دعا پہلے بیٹے کے مانگنے کے وقت کی ہے اور اس امر پر لوگوں کا اتفاق ہے کہ اسمٰعیلؑ علیہ السلام عمر میں حضرت اسحٰقؑ سے بڑے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اس دعا میں مراد حضرت اسمٰعیلؑ ہیں۔ پھر اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے ذبح کا واقعہ بیان فرمایا ہے۔ پس لازماً ذبیح حضرت اسمٰعیلؑ ہی ہو سکتے ہیں۔

(اس بیان کا الجھاؤ اور ضعف استدلال واضح ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ بات نکلے کہ انھوں نے ایک بیٹے کے لئے دعا کی تھی۔ لیکن اس میں دلیل کا جو پہلو ہے وہ نمایاں ہے اور ہم اس کو بیسویں اور اکیسویں فصل میں بیان کر چکے ہیں۔ وہاں دیکھنا چاہئے)

۲۔ متعدد روایات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ میں مینڈھے کے سینگ موجود تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذبح کا واقعہ مکہ میں پیش آیا اگر ذبیح حضرت اسحٰقؑ ہوتے تو ذبح کا واقعہ شام میں پیش آتا۔

جو لوگ مدعی ہیں کہ ذبیح حضرت اسحٰق علیہ السلام ہیں وہ دو دلیلیں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ آیت کے اول و آخر سے ثابت ہوتا ہے کہ ذبیح حضرت اسحٰقؑ ہیں۔ آیت کے شروع میں حضرت ابراہیمؑ کی زبانی منقول ہے انی ذاھب الی ربی سیھدین۔ (میں اپنے پروردگار کی طرف جاتا ہوں وہ میری رہبری فرمائے گا۔) علماء کا اتفاق ہے کہ اس سے مراد ہجرت ہے جو انھوں نے شام کی طرف فرمائی۔ پھر اس کے بعد ہے فبشرناہ بغلام حلیم (پس ہم نے اس کو ایک بردبار بیٹے کی خوشخبری دی) ضروری ہے کہ اس سے حضرت اسحٰقؑ مراد ہوں۔ پھر اس کے بعد ہے فلما بلغ معہ السعی (پس جب وہ اس کے ساتھ دوڑنے پھرنے کی عمر کو پہنچا) یہ مقتضی ہے کہ دوڑنے پھرنے کی عمر کو پہنچ جانے والے بیٹے سے وہی بیٹا مراد ہو جو شام میں پیدا ہوا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ آیت کے ابتدائی حصہ میں اس امر کا نہایت واضح ثبوت موجود ہے کہ ذبیح حضرت اسحٰقؑ ہیں۔

یہی حال آیت کے آخری حصہ کا ہے۔ اس سے بھی یہی نکلتا ہے کہ قربان ہونے کا شرف حضرت اسحٰقؑ ہی کو حاصل ہوا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ذبح کا واقعہ بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وبشرناہ باسحٰق نبیا من الصالحین (اور ہم نے اس کو خوش خبری دی اسحٰق کی جو نبی ہوگا نیکوکاروں میں سے) جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضرت اسحٰقؑ کے نبی ہونے کی بشارت دی گئی ہے۔ اب اس بشارت کا واقعہ ذبح کے بعد آنا چاہتا ہے کہ ان کی نبوت کی بشارت اس وجہ سے دی گئی ہو کہ انھوں نے وہ مصائب برداشت کئے جو ذبح کے سلسلہ میں پیش آئے۔ الغرض جیسا کہ ہم نے کہا، آیت کا شروع و آخر دونوں حضرت اسحٰقؑ کے ذبیح ہونے کو چاہتا ہے۔

(علامہ ابن جریر رحمہ اللہ کی پہلی دلیل یہی ہے اور اس میں جو کھلی ہوئی کمزوری ہے اسکو چھتیسویں فصل میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ اس کو دیکھنا چاہیے")

۲۔ دوسری دلیل وہ مشہور خط ہے جو یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کو لکھا جو یوں شروع ہوتا ہے "من یعقوب اسرائیل نبی اللہ ابن اسحاق ذبیح اللہ ابن ابراہیم خلیل اللہ" (اس طرح کی روایات کی تردید کی ضرورت نہیں ہے۔ فراہی) اس باب کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے۔ اور زجاجؒ فرمایا کرتے تھے کہ "اللہ بہتر جانتا ہے کہ دونوں میں کون ذبیح ہے"۔

اس مسئلہ پر امام رازیؒ نے جو کچھ لکھا ہے وہ اوپر بیان ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انھوں نے دونوں فریق کے دلائل بیان کر کے معاملہ کو ختم کر دیا ہے۔ ان دلیلوں کی جانچ پڑتال پر توجہ نہیں کی ہے۔ اور نہ یہ کھولا ہے کہ وہ خود کس گروہ کے ساتھ ہیں۔ صاحب کشاف نے بھی یہی کیا ہے۔ لیکن ان کا عام قاعدہ یہ ہے کہ وہ جس مذہب کو پہلے بیان کرتے ہیں اور جس کے دلائل کو زیادہ پھیلا کر لکھتے ہیں وہ مذہب ان کے نزدیک راجح ہوتا ہے۔

علامہ ابن کثیرؒ کے بیانات کا خلاصہ

علامہ ابن کثیرؒ نے اس مسئلہ پر روایۃً ودرایۃً دونوں طریقوں سے بحث کی ہے۔ اور اسمیں شبہ نہیں کہ وہ ان دونوں چیزوں میں اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے بعض مباحث کا خلاصہ ہم نے تیئسویں (۲۳) فصل میں دیا ہے۔ اب ہم ان کے وہ دلائل بیان کرتے ہیں جو انھوں نے قرآن اور تورات سے اخذ کئے ہیں اور جن سے علامہ ابن جریرؒ کے توہمات دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں فبشرناہ بغلام حلیم کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہاں غلام سے مراد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں۔ یہی پہلے بیٹے ہیں جنکی پیدائش کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خوشخبری دی گئی۔ مسلمان اور اہل کتاب دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ یہ حضرت اسحٰق سے بڑے تھے۔ توریت سے تو یہانتک ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۸۶ برس کی تھی اور حضرت اسحٰقؑ کی ولادت کے وقت حضرت ابراہیمؑ نوے برس کے تھے۔ (یہاں تھوڑا سا تسامح ہوگیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی یہ عمر اسوقت تھی جب حضرت اسحاقؑ کی ولادت کی خوشخبری ان کو ملی ہے۔ حضرت اسحٰقؑ کی ولادت کے وقت وہ سَو سال کے تھے جیسا کہ چھٹی فصل میں ہم بیان کر آئے ہیں۔) اہل کتاب کے یہاں یہ امر مسلم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو اکلوتے بیٹے کے ذبح کا حکم ہوا تھا اور تورات کے ایک نسخہ میں "پہلوٹی کے بیٹے کے" الفاظ ہیں۔ اس موقع پر انھوں نے بالکل جھوٹ حضرت اسحٰقؑ کا نام ڈالدیا ہے حالانکہ یہ بات ان کی کتاب کے صریح بیانات کے قطعی خلاف ہے۔ حضرت اسحٰقؑ کا نام داخل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کے باپ تھے اور حضرت اسمٰعیلؑ عربوں کے باپ تھے۔ پس بربنائے حسد انھوں نے اپنی کتاب میں زیادتی کرکے اس میں تحریف کردی۔

انھوں نے "اکلوتے" کے معنی تحریف کرکے یہ کردیئے کہ "وہ جس کے سوا تیرے ساتھ کوئی اور نہیں" کیونکہ حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ کو مکہ پہنچا دیا گیا تھا۔ یہ کھلی ہوئی تحریف ہے کیونکہ "اکلوتا" تو وہی ہو سکتا ہے جس کے سوا کوئی اور بیٹا نہ ہو۔ (ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ بیر سبع میں حضرت اسمٰعیل ہی حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ تھے۔ یہانتک کہ حضرت ابراہیمؑ ان کو قربان گاہ کی طرف لے گئے اور پھر وہیں بسایا۔ دیکھو فصل ۵) نیز یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ پہلوٹھی کے بیٹے کو جو قدر و عزت حاصل ہوتی ہے وہ بعد کی اولادوں کو حاصل نہیں ہوتی۔ پس جانچ اور امتحان کے لئے مناسب یہی تھا کہ پہلوٹھی کے بیٹے کو ذبح کا حکم دیا جائے۔"

اس کے بعد علامہ ابن کثیر ان لوگوں کا ذکر کرتے ہیں جو قائل ہیں کہ ذبیح حضرت اسحاقؑ ہیں اور فرماتے ہیں:-

" ہمارے نزدیک یہ بات احبار یہود کے بیانات سے بغیر کسی بحث و حجت کے لے لی گئی ہے۔ اور یہ کتاب الٰہی صاف شہادت دے رہی ہے کہ ذبیح حضرت اسمٰعیلؑ ہیں۔ اس میں ایک غلام حلیم کی بشارت ہے۔ پھر یہ بیان ہے کہ وہ ذبیح ہے، پھر اس کے بعد ہے "وبشرناہ باسحٰق نبیا من الصالحین" اور جب ملائکہ نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحٰق کی بشارت دی کہا "انا نبشرک بغلام علیم" اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا "فبشرناہ باسحٰق ومن وراء اسحٰق یعقوب" یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت اسحٰق کی زندگی ہی میں حضرت اسحٰق کو اللہ تعالیٰ ایک بیٹا عنایت فرمائے گا جس کا نام یعقوب ہوگا جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی نسل بھی چلے گی۔ ایسی حالت میں جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں یہ کسی طرح جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ بالکل بچپنے کی حالت میں ان کے ذبح کا حکم دیدے کیونکہ وہ وعدہ فرما چکا ہے کہ اس بیٹے سے نسل برپا ہوگی۔"

پھر آگے چلکر فرماتے ہیں۔

" اور حضرت اسمٰعیلؑ کی صفت یہاں حلم بیان فرمائی ہے کیونکہ موقع کے لحاظ سے مناسب یہی ہے۔ اور فلما بلغ معہ السعی۔ یعنی جب سیانے ہوئے اور اپنے باپ کے ساتھ چلنے پھرنے لگے۔"

پھر فرماتے ہیں۔

" یہ بات انھوں نے بیٹے کو بھی بتادی تاکہ طاعت الٰہی اور طاعت پدر میں بیٹے کی استقامت اور شجاعت وعزیمت کا بھی امتحان لے لیں۔ ادھر سے جواب ملا یا ابت افعل ماتؤمر یعنی اللہ تعالیٰ نے میرے ذبح کا جو حکم آپ کو دیا ہے وہ پورا کیجئے۔ ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین۔ یعنی اس پر ثابت قدم رہوں گا۔ اور اس کے صلہ کے لئے اللہ تعالیٰ سے امید کروں گا۔ پھر پوری استقامت کے ساتھ اپنے اس وعدہ کی سچائی ثابت کردی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بھی اس کا ذکر فرمایا۔ " واذکر فی الکتاب اسمٰعیل انہ کان صادق الوعد وکان رسولا نبیا وکان یامر اہلہ بالصلوٰۃ والزکوٰۃ وکان عند ربہ مرضیا۔"

اس کے بعد علامہ ابن جریرؒ کی دلیل کے ماخذ کا ذکر کرکے لکھتے ہیں:۔

" اسی پر اپنی تفسیر میں انھوں نے اعتماد کیا ہے، حالانکہ یہ کوئی مذہب نہیں ہے۔ یہ اصل حقیقت سے بہت دور ہے۔ البتہ وہ استدلال جس سے محمد بن کعب قرظی اس بات پر دلیل لائے ہیں کہ ذبیح حضرت اسمٰعیلؑ ہیں نہایت صحیح اور نہایت مضبوط ہے۔"

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جہاں تک ظاہری دلائل کا تعلق ہے علامہ ابن کثیرؒ نے ان میں سے اکثر بیان کردیئے ہیں۔ اور متاخرین میں کوئی شخص بھی ان سے آگے نہیں جاسکا اس لئے ان کے اقوال کے استقصار کی چنداں ضرورت نہیں البتہ اگلی فصل میں ہم بعض مشاہیر متاخرین کے اقوال سے اس حد تک تعرض کریں گے جس حد تک اس باب میں ان کی رائے ظاہر کرنے کے لئے کافی ہو۔

(باقی)

والنجم اذا ھوی

از

جناب مولوی داؤد اکبر صاحب اصلاحی

آج کی صحبت میں مختصراً ہم والنجم کی قسم پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے متعلق سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'والنجم' سے کیا مراد ہے؟ اس سوال کے جو جواب ہمارے مفسرین کرام دیتے ہیں، پہلے ہم مختصراً ان کو بیان کریں گے۔

مفسرین کے جوابات مختلف ہیں۔

۱۔ بعض لوگ کہتے ہیں نجم سے مراد ثریا ہے۔

۲۔ بعضوں کے نزدیک اس سے عام ستارے مراد ہیں۔

۳۔ بعضوں کے نزدیک اس سے ٹوٹنے والے ستارے مراد ہیں۔

۴۔ بعض حضرات اس سے نجوم قرآن مراد لیتے ہیں۔

۵۔ بعض اس سے نباتات مراد لیتے ہیں۔

ان میں سے پہلا اور دوسرا قول زیادہ مشہور ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ لغت اور کلام عرب کے استعمالات سے انہی دونوں کی تائید ہوتی ہے۔ بقیہ اقوال یا تو بالکل غیر مستند ہیں یا زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ بعض غریب شواہد سے ان میں سے بعض کی تائید ہو سکتی ہے اور تاویل قرآن میں غریب اقوال و شواہد سے استناد اہل علم کے نزدیک جائز نہیں۔

پس مقابلۂ ترجیح صرف پہلے دو قولوں میں ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک مرجح قول دوسرا ہے اور اس کے وجوہ ہیں۔ اور یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ تیسرا قول دوسرے قول کے عموم میں داخل ہے۔

(۱) جہاں تک استعمال کا تعلق ہے۔ والنجم جنس نجوم کے لئے عام طور پر مستعمل ہے۔

علامہ ابن جریر رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

وکان بعض اهل المعرفة بکلام	بصرہ کے بعض ماہرین لغت عرب
العرب من اهل البصرة یقول	کہتے تھے کہ والنجم سے عام
عنی بقوله "والنجم" والنجوم	ستارے مراد ہیں۔ لفظ واحد
وقال ذهب الی لفظ الواحد	ہے مگر معنی میں جمع
وهو فی معنی الجمیع	کے ہے

علامہ ابن جریرؒ نے اس قول کی تائید میں یہ شعر بھی پیش کیا ہے۔

فباتت تعد النجم فی مستحیرة   سریع بایدی الآکلین جمودها

ایک دوسرا شعر ہے

فبات یریه عرسه و بناته   وبت اریه النجم این مخافقه

ہم کلام عرب سے اس قول کی تائید میں اور شعر بھی پیش کر سکتے ہیں مگر چونکہ یہ امر مختلف فیہ نہیں ہے اس لئے زیادہ طوالت کی ضرورت نہیں۔

(۲) قرآن مجید میں 'والنجم' عام ستاروں ہی کے لئے لیا ہے۔ مثلاً۔

وَعَلٰمٰتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ	اور بہت سی علامتیں اور ستاروں سے بھی
۱۶۔ نحل	وہ رستہ معلوم کرتے ہیں۔

یہاں قطعی ہے کہ والنجم سے عام ستارے ہی مراد ہو سکتے ہیں، صرف ثریا کو نہیں مراد لے سکتے

کیونکہ 'اہتدا' راستہ معلوم کرنا صرف ثریا کے ساتھ مخصوص نہیں ہے خلق کو یہ فیض بہت سے ستاروں سے حاصل ہوتا ہے۔ عرب شعرا نے بہت سے شعروں میں 'ثریا' کا ذکر کیا ہے اور اس کے خواص وآثار کی طرف بھی اشارہ کئے ہیں لیکن جہاں تک مجھے علم ہے کسی شعر سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اہتداء اس کی مخصوصات میں سے ہے۔ امراء القیس کا ایک شعر ہے۔

ودویۃ لایہتدی لفلاتہا بعرفان اعلام ولاضوء کوکب

اس میں وہ 'اہتدا' کو بے تکلف عام کواکب و نجوم کا فیض قرار دیتا ہے اور امراء القیس کا کیا ذکر خود قرآن میں ہے۔ وھوالذی جعل لکم النجوم لتھتدوا بھا فی ظلمات البر و البحر قد فصلنا الآیات لقوم یعلمون۔

سورہ رحمن کی آیت ہے

وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ اور ستارے اور شجر سجدہ کرتے ہیں۔

اس میں بھی والنجم عام ستاروں ہی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ شجر کا تقابل مقتضی ہے کہ والنجم میں بھی عمومیت ہو۔ علاوہ ازیں قرآن میں سجود کی نسبت عام ستاروں کی طرف کی گئی ہے۔ بعض لوگوں نے النجم کے معنی یہاں نباتات کے لئے ہیں لیکن یہ قول غایت درجہ سخیف اور ہمارے اصول تاویل ے بالکل خلاف ہے۔ یہاں ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔

سورہ طارق کی آیت بھی ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے۔

وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ، النَّجْمُ اور تو کیا جانے کہ شب آہنگ کیا ہے؟

الثَّاقِبُ وہ چمکتا ستارہ۔

ان شواہد سے یہ بات بالکل صاف ہے کہ قرآن مجید میں والنجم کا لفظ جنس نجوم کیلئے متعدد مقامات میں آیا ہے اور ایسے واضح قرائن کے ساتھ کہ کسی کے لئے گنجائش اختلاف نہیں۔

برعکس اس کے ایک شہادت بھی ایسی موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قرآن مجید میں النجم خاص ثریا، کے لئے استعمال ہوا ہے۔ پھر ایسی حالت میں والنجم کی قسم میں ثریا مراد لینے سے زیادہ اقرب، واضح اور مدلل بات یہ ہے کہ ہم اس سے جنس نجوم کو مراد لیں، جیسا کہ سلف میں سے بعض اہل عربیت کا یہ مذہب ہے۔

یہاں تک ہم نے لفظ پر لغت اور استعمالات کی روشنی میں بحث کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ایک لفظ جس کا اطلاق مختلف معانی پر ہو سکتا ہو کلام میں اس کے صحیح معنی کی تعیین کا فیصلہ سیاق و سباق اور محل و مقام کے مقتضیات و مناسبات پر منحصر ہے۔ اور یہاں تو قسم و مقسم علیہ کی صورت ہونے کی وجہ سے گویا مدار فیصلہ مقسم علیہ پر ہے۔ لفظ کے مختلف استعمالات میں سے جو استعمال مقسم علیہ سے بالکل ٹھیک ٹھیک لگ جائے اور جس سے دونوں کے درمیان ایک واضح اور خوبصورت مناسبت نمایاں ہو جائے پس سمجھنا چاہئے کہ لفظ اسی معنی کے لئے استعمال ہوا ہے۔

لیکن مقسم علیہ کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے سورہ نجم کا عمود (مضمون) واضح کر دیں۔

سورہ نجم ان سات سورتوں (از ق تا سورہ واقعہ) میں سے ایک ہے جو اثبات قرآن میں نازل ہوئی ہیں اور مختلف پہلوؤں سے قرآن کی حقانیت، برتری، پاکیزگی کی شہادت دے رہی ہیں (اس اجمال کو سمجھنے کے لئے علامہ فراہیؒ کی تفسیر سورہ ذاریات ملاحظہ فرمائیے) چنانچہ اس سورہ کے شروع و آخر میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ اور بیچ میں جو باتیں عمود سے بظاہر بے تعلق نظر آتی ہیں وہ بھی عمود کے ساتھ وابستہ ہیں لیکن اس کی توضیح کے لئے ہم کو ایک لمبی بحث لکھنی پڑے گی جس کے لئے یہ جگہ مناسب نہیں۔ یہاں شہادت اور دعوی یعنی قسم اور مقسم علیہ پر غور کرنے سے اتنی بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ ستاروں کے سقوط کو قرآن اور وحی اور پیغمبر صلعم کی

صداقت کی شہادت کے طور پر پیش کیا ہے۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی ۝ مَا ضَلَّ	ستاروں کی قسم جبکہ وہ جھکتے ہیں کہ تمھارا
صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی ۝ وَمَا یَنْطِقُ	ساتھی نہ بھٹکا نہ بہکا اور نہ اپنے جی سے
عَنِ الْهَوٰی ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ	باتیں بناتا یہ تو وحی ہے جو اس پر نازل
یُّوْحٰی ۔ ۔ ۔ ۔	ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ وَلَقَدْ رَاٰی مِنْ	۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس نے اپنے رب
اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی ۝	کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

ان آیات پر غور کیجیے، قرآن، جبریل امین اور آنحضرت صلعم کو ہر طرح کی لغزش، گمراہی، کھوٹ وغیرہ سے بری اور محفوظ بتایا گیا ہے۔ وحی کے ساتھ حضرت جبریل اور آنحضرت صلعم کا ذکر اس وجہ سے ہوا کہ ایک واسطہ وحی ہیں اور ایک مہبط وحی، پس وحی کی حقانیت اور صداقت اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتی جبکہ واسطہ اور مہبط کی قوت و حفاظت بھی واضح نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس سورہ میں ستاروں کے سقوط کی قسم کے بعد ان تینوں کا ذکر ایک ساتھ کیا اور اس طرح قرآن کی حقانیت و صداقت کی گواہی دی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ستاروں کے سقوط کو وحی، صاحب وحی اور حامل وحی کی صداقت سے کیا تعلق؟ مقدم الذکر بات مؤخر الذکر پر کیونکر دلیل و شہادت ہو سکتی ہے؟؟ یہ سوال ذرا ٹیڑھا ہے اس پر غور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قرآن میں اس کے نظائر تلاش کریں۔ اور انکی روشنی میں اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کریں۔

قرآن مجید میں ستاروں کے سقوط کی قسم کے ساتھ قرآن مجید کا ذکر دو تین جگہ آیا ہے، پہلے ہم ان آیات کو نقل کریں گے اور اس کے بعد ان کے قدر مشترک پر غور کر کے قسم اور مقسم علیہ کے باہمی تعلق

کی نوعیت کو معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہمارے سامنے سورہ واقعہ کی یہ آیات آتی ہیں۔ فرمایا۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ ه وَاِنَّهٗ
لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ه اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ
كَرِيْمٌ ه فِىْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ه لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا
الْمُطَهَّرُوْنَ ه تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ه اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ
اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں تاروں کے گرنے کی اور سمجھو تو یہ بہت ہی بڑی قسم ہے کہ یہ قرآن بڑی قدر و منزلت کا قرآن ہے اور ایک محفوظ کتاب میں ہے اس کو صرف پاک فرشتے ہی چھو سکتے ہیں۔ پروردگار عالم کی طرف سے اتارا ہوا ہے کیا تم لوگ اس کلام سے منکر ہوتے ہو۔

پھر اس سے زیادہ تفصیل اور مطابقت کا پہلو لئے ہوئے سورہ تکویر کی آیات نمایاں ہوتی ہیں۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ه الْجَوَارِ
الْكُنَّسِ ه وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ
وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ اِنَّهٗ لَقَوْلُ
رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ه ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى
الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ه مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ
وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ه وَلَقَدْ رَاٰهُ
بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ه وَمَا هُوَ عَلَى
الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ه وَمَا هُوَ بِقَوْلِ
شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹ جانے سیدھے چلتے دبک جانے والوں کی اور رات کی جب وہ پیچھے ہٹ جائے اور صبح کی جب وہ سانس لے۔ بیشک یہ ایک باعزت فرستادہ کا قول ہے جو قوت والا اور تخت کے مالک کے پاس عزت والا ہے سب کا مانا ہوا اور معتبر ہے اور تمھارا ساتھی مجنون نہیں ہے اور اس نے اس کو دیکھا ہے آسمان کے کھلے کنارے میں اور وہ غیب کا بخیل (حریص) نہیں ہے اور یہ کسی شیطان مردود کا قول نہیں ہے۔

NATIONAL MUSLIM L
جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی

ان تینوں مقامات کا ایک دوسری کی نظیر اور شاہد ہونا اس قدر واضح ہے کہ اس پر بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ ان تینوں میں ستاروں کی قسم ہے پھر ہر جگہ ان کے گرنے، غائب ہونے، پیچھے ہٹنے چھپ جانے کا ذکر ہے۔ مقسم علیہ الفاظ میں گو مختلف ہو مگر حقیقت کے اعتبار سے تینوں جگہوں میں ایک ہی ہے۔ قرآن کا باعزت، بلند، اور ارواح خبیثہ کی دسترس سے بلند ہونا ہر جگہ مذکور ہے۔ ان تین میں سے دو مقامات میں حضرت جبریل کا طاقتور، مکرم، مطاع اور امین ہونا واضح لفظوں میں بیان ہوا ہے۔ اور ایک جگہ اشارۃ اس کا ذکر ہوا ہے علاوہ ازیں دو جگہوں میں آنحضرتؐ کو گمراہی، ضلالت اور جنون وغیرہ سے بری اور مصئون قرار دیا گیا ہے۔

ان دونوں نظیروں کی روشنی میں اگر سورہ نجم کی قسم اور مقسم علیہ پر غور کیا جائے۔ تو صحیح نتیجہ تک پہنچنا کچھ زیادہ مشکل نہیں رہ جاتا ہے۔ اور دو واضح مطابقتیں سمجھ میں آجاتی ہیں۔

۱۔ منکرین رسالت کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ آنحضرت صلعم کے متعلق یہ خیال رکھتے تھے کہ یہ شخص کاہن یعنی ایک طرح کا عامل ہے اور اس نے جنات اپنے بس میں کر رکھے ہیں وہ غیب کی خبریں اس کو آکر بتا دیتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس کی تردید فرماتے ہوئے ستاروں کے سقوط سے شہادت پیش کی کہ خدا کے پردہ غیب تک کسی شیطان و جن کی رسائی نہیں اور اگر کبھی کوئی شیطان کان لگانے کی کوشش کرتا ہے تو خدا کی طرف سے ایک شہاب ثاقب اسکا پیچھا کرتا ہے سورہ حجر میں فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا	اور ہم نے آسمان میں برج بنائے اور اسکو
وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ وَحَفِظْنَاهَا	دیکھنے والوں کے لئے ستاروں سے آراستہ
مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ إِلَّا مَنِ	کیا اور ہر شیطان مردود سے اس کی حفاظت
اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ	کی مگر کوئی کان لگائے تو ایک دمکتا شہاب
مُبِينٌ ۔	اس کے پیچھے لگا ہوتا ہے۔

سورہ صافات میں ہے۔

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ	اور ہم نے زینت دی سماء دنیا کو ستاروں سے
وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ لَا	اور محفوظ کیا ہر سرکش شیطان سے وہ ملاء اعلی
يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ	کی طرف کان بھی لگانے نہیں پاتے اور کھدیڑنے
مِنْ كُلِّ جَانِبٍ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ	کے لئے ہر طرف سے ان پر شہاب پھینکے جاتے
وَّاصِبٌ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ	ہیں اور ان کیلئے لازمی عذاب ہے، مگر ہاں کوئی
فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ	بات اگر کوئی اچک لیجاتا ہے تو شہاب کا دمکتا ہوا انگارا

سورہ شعراء میں یہ مضمون اور بھی واضح ہو گیا ہے۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ وَمَا	اور اس قرآن کو (جیسا کہ کفار کہتے ہیں) شیطان
يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۔	لیکر نہیں اترے۔ اور نہ یہ کام ان کے کرنیکا ہے
اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ	اور نہ وہ اسکو کر سکتے ہیں وہ تو سننے سے بھی محروم رکھے گئے ہیں۔

پھر اسی سورہ میں ان لوگوں کو بھی بتا دیا ہے جن پر شیطان اترتے ہیں۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ	کیا میں تمہیں بتاؤں کن پر شیطان اترا کرتے
تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ يُّلْقُوْنَ	ہیں۔ اترتے ہیں ہر جھوٹے بدکردار پر جو کان
السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ	لگاتے ہیں اور اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔

یہ مضمون قرآن مجید میں کئی جگہ بیان ہوا ہے۔ اور شواہد بکثرت ہیں، بقصد اختصار ان کا ذکر ہم اس وقت نظر انداز کرتے ہیں۔

اوپر مفسرین کے جو اقوال "النجم" کے متعلق ہم نے نقل کئے ہیں ان میں ایک مذہب یہ بھی ہے کہ اس سے ٹوٹنے والے نجوم مراد ہیں اور ہم نے اس کو دوسرے قول کے عموم میں داخل سمجھا ہے۔

پس اگر یہ تاویل اختیار کی جائے تو قسم اور مقسم علیہ میں ایک واضح تعلق نمایاں ہو جاتا ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ ہر جگہ ستاروں کے سقوط، وقوع اور پیچھے ہٹنے اور چلکر غائب ہونے کی قید ہی قسم کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ پس اس روشنی میں اگر سورہ نجم کی ابتدائی آیات پر غور کیا جائے تو گویا ٹوٹنے والے تاروں کو شہادت میں پیش کرکے فرمایا کہ ما ضل صاحبکم وما غوی جس طرح سورہ تکویر میں فرمایا کہ ما صاحبکم بمجنون۔ یعنی پیغمبر کے متعلق تم جو یہ گمان کرتے ہو کہ وہ کاہنوں اور عاملوں کی طرح جنوں اور شیطانوں کی مدد سے غیب کی باتیں پیش کرتا ہے تو تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ پیغمبر اس طرح کی ضلالت و غوایت سے پاک ہے۔ کاہن جھوٹے اور لپاٹیے ہوتے ہیں کیونکہ خدا کے غیب سے کوئی واقف نہیں۔ کوئی جن اور شیطان اگر کان لگاتا ہے تو خدا کے شہاب ثاقب اس کی سرزنش کرتے ہیں۔ مگر یہ کاہن جو افاک اور اثیم ہوتے ہیں اپنے جی سے من گھڑت فسانے سناتے ہیں اور اس کو الہام غیب بتاتے ہیں۔ اور اس پیغمبر کا حال یہ ہے کہ

وما ینطق عن الہوی، ان ھو الا وحی یوحی۔

اس کے بعد پیغمبر صلعم کے واسطۂ علم کا ذکر فرمایا کہ اس کا واسطۂ علم کاہنوں کا شیطان نہیں بلکہ خدا کا جبریل امین ہے، علمہ شدید القوی۔ وہ زبردست طاقت والا ہے کوئی شریر طاقت اس کو مغلوب و متاثر نہیں کر سکتی۔ وہ مردود و رجیم نہیں بلکہ صاحب عرش کے ہاں عزت والا اور مطاع و امین ہے۔ پھر یہ وحی کوئی خطفۂ شیطانی اور نزغۂ ابلیسی نہیں بلکہ قرب و اتصال کے چشمے سے ابلی ہے۔ ثم دنا فتدلی فکان قاب قوسین او ادنی فاوحی الی عبدہ ما او پھر مہبط وحی کے قلب و نگاہ کی پاکی، ہوشیاری اور بیداری کی شہادت دی کہ ان تجلیات و انوار گوناگوں اور مشاہدہ آیات عظیمۂ بوقلموں نے ایک لمحہ کیلئے بھی اس کے چشم و دل کو حیران و درماندہ اور گوش و ہوش کو عاجز و سرگشتہ نہیں بنایا۔ ما کذب الفؤاد ما رأی۔ ...... ما زاغ البصر

وما طغی۔ لقد رأی من آیات ربہ الکبریٰ۔

ہم نے بات مختصر کر دی ہے۔ ان مقامات کی تشریح کے لئے دفتر چاہئے، اور جب تک لفظاً و روایتاً کی گرہیں نہ کھول دی جائیں اسوقت تک اس تاویل کا اصلی حسن بے نقاب نہیں ہو سکتا جو اوپر بیان ہوئی ہے لیکن اسوقت ہم اس بحث کو زیادہ پھیلانا نہیں چاہتے۔ ان شاء اللہ پھر کسی فرصت میں ان آیات پر مفصل بحث کریں گے اس وقت صرف یہ مد نظر ہے کہ اس سورہ کی قسم اور مقسم علیہ کے متعلق غور کرنے کیلئے ہمارا نقطہ نظر بالاجمال سامنے آجائے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ ستاروں کی پرستش دنیا کی قدیم ترین چیزوں میں سے ہے۔ حضرت ابراہیم کی قوم کی کواکب پرستی کا ذکر خود قرآن پاک میں نہایت تفصیل کے ساتھ ہوا ہے۔ ان ستاروں کو قومیں مختلف قوتوں اور تصرفات کا مصدر سمجھتی تھیں۔ اور اس لئے ان کے بت بنا کر ان کو پوجتی تھیں۔ عرب کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی ستاروں کو مختلف اعتبارات سے ایک خاص روحانی حیثیت حاصل تھی۔ خود اس سورہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے وانہ ھو رب الشعریٰ کہکر اسی طرح کے ایک واہمہ کی تردید کی ہے۔ شعریٰ کے متعلق ایک شاعر کا یہ مصرعہ مشہور ہے۔ اذا ذکت الشعریٰ فبرد وطل۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ عرب میں علم نجوم کو خاص اہمیت حاصل تھی اور جو لوگ اس میں دخل رکھتے تھے وہ گویا اسرار غیب کے کلید بردار سمجھے جاتے تھے۔

قرآن مجید نے عربوں کے اسی طرح کے تخیلات کی بنا پر ایک سے زیادہ مقامات میں کواکب و نجوم کی تسخیر، ان کے افول، ان کے سقوط، ان کے سجود اور ان کے ایک بندھے ٹکے اصول پر گردش کرنے کا ذکر فرمایا ہے۔ اور اس سے ثابت کیا ہے کہ جو خود دوسرے کے امر و فرمان کے آگے سر بسجود اور محکوم و مجبور ہیں وہ معبود و مسجود ہونے کی عزت کیسے پا سکتے ہیں۔ اور ان کو علم، قوت اور حیات کا سرچشمہ کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ والشمس، والقمر، والنجوم مسخرات بامرہ۔

پس ہو سکتا ہے کہ عربوں کے اس عام تخیل کے لحاظ سے ستاروں کے سقوط و سجود وشہادت میں پیش کر کے پیغمبر صلعم اور وحی الٰہی کی صداقت ثابت کی ہو یعنی یہ وحی جس توحید کی دعوت ہے اس توحید کی گواہی آسمان کے ستارے بھی اسی ایک خدا کے سامنے جھک کر دیتے ہیں ۔ س کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ سورہ نجم میں قرآن کا اثبات، اثبات توحید کے پہلو سے ہے۔ نیز اسی سورہ میں وانہ ھو رب الشعریٰ بھی فرمایا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

معین المنطق

حصہ اول و دوم کے نام سے یونیورسٹیوں اور مدارس اسلامیہ کے طلبہ کے لیے حسب ضرورت زمانہ سلیس اردو منطق کی پہلی اور دوسری کتاب پر مشتمل نئی طرز پر ایک آسان مجۂ درس جناب مولانا مفتی محمود الحسن صاحب مدرس اول جامعہ رنذیریہ نے تیار کیا ہے۔ جس پر اہرین فن اور جرائد نے بہترین ریویو اور پرزور سفارشیں تحریر فرمائی ہیں۔

اس کورس میں تحقیق، اختصار، جامعیت کے ساتھ مضامین فن تمہیدات، نقشہ جات، ریفات کے ضمن میں ایسی تسہیل و توضیح سے پیش کیے گئے ہیں کہ اس کو حصول فن اور امتحانات یں کامیابی کی گارنٹی تسلیم کرنے میں مبالغہ نہ ہوگا۔ ان اغراض کے پیش نظر ہر ایک طالبعلم کو اس کا یلے ایک نسخہ ضرور مطالعہ میں رکھنا چاہیے۔

قیمت:- حصہ اول ۳/ اور حصہ دوم قسم اول ۸/ و قسم دوم ۷/

"منیجر"

مقالات

سیرتِ شبلی

از جناب مولانا اقبال احمد صاحب سہیل ایم۔ اے علیگ

شیخ صاحب کی وفات کے بعد ایک مہاجن نے نالش کی، سمن آیا تو فرمانے لگے۔ کاش والد ایک پیسہ کی جائداد نہ چھوڑتے مگر قرض تو نہ چھوڑا ہوتا اور آج عدالت میں بحیثیت مقروض مدعا علیہ حاضر ہونے کی ذلت تو برداشت نہ کرنی پڑتی۔ یہ جذبہ اس قدر قوی تھا کہ ادائیگی قرض کا خیال ان کو جنون کی حد تک مستولی ہوگیا تھا۔ اور اپنا کتب خانہ جو آپ کی زندگی بھر کی کمائی تھی اور جس کو وہ اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے فروخت کرنے پر طیار ہو گئے تھے۔ ایک خط میں ..... کو لکھتے ہیں

. . . .

. . . .

. . . .

سچ ہے

اذا ہم القی بین عینیه عزمه   ونکب عن ذکر العواقب جانبا

قدرت نے بھی امداد کی اور بڑا جز قرضہ کا محض مولانا کی نیک نیتی اور حسن سلوک کی بدولت

اس طرح پر ادا ہو گیا کہ مولانا نے مظفر کو اعظم گڈھ اور اطراف اعظم گڈھ کی جائدادوں میں اس کے استحقاق سے زائد دیدیا۔ جس سے خوش ہو کر مولانا کی سوتیلی ماں اور مظفر کی دادی نے وہ جائداد جو تنہا اس کے نام تھی قرضہ مشترکہ کے عوض میں مہاجن کو دیدی۔ اس طرح ایک مہاجن سے جس کا مطالبہ سب سے زیادہ تھا نجات ہو گئی اب کچھ اور متفرق قرضہ جات جن کی مجموعی تعداد ابھی خاصی تھی ان کی ادائیگی کا انتظام کرنا تھا۔ اس کے لئے یہ تدبیر سوچی کہ کچھ مولوی اسحاق صاحب اپنی آمدنی سے ادا کریں اور کچھ جائداد کے منافع سے ادا کیا جائے اور کچھ خود اپنے پاس سے ادا کریں۔ مگر اپنے پاس کوئی ایسا ذریعہ آمدنی نہ تھا جس سے کچھ پس انداز کر سکیں۔ نوکری چھوڑ چکے تھے۔ اب صرف حیدرآباد کا وظیفہ اور تصنیفات کی آمدنی تھی۔ وہ ذاتی مصارف اور زیر تصنیف کتابوں کی طباعت ہی کیلئے بمشکل کافی ہو سکتی تھی۔ مولانا اسی ادھیڑ بن میں تھے، کوئی صورت سمجھ میں نہ آتی تھی، دماغ ان غیر معمولی ترددات سے تھک کر سکون کا طالب تھا۔ اس لئے مولانا نے چاہا کہ کچھ دنوں کے لئے اس ماحول سے علحدہ ہو جائیں اور ذرا دم لیکر پھر ان خانگی گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف ہوں، اس خیال کا دماغ میں آنا تھا کہ منزل کا تعین کئے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے۔

چلا ہے شوق بے خبر جنوں میں جانے کدھر
نہ کوئی منزل سفر نہ قید کچھ مقام کی

ریلوے اسٹیشن پہنچے تو پہلے غازی پور کا ٹکٹ لیا۔ غازیپور سے علیگڑھ اور وہاں سے حیدرآباد کو روانہ ہو گئے۔

مولانا کا دوسرا عقد مولانا مسلسل کئی سال سے ریاح باسوری اور قبض میں مبتلا تھے۔ یہ شکایت زوجہ اولی کے وفات کے بعد سے شروع ہو کر روز افزوں ترقی پر تھی اکثر اطبا اور ڈاکٹروں کی رائے میں تقوی کے ساتھ مسلسل تجرد اس کا باعث تھا اس لئے طبی مشورہ تھا کہ مولانا

نکاح ثانی کریں۔ مولانا، اپنی علمی زندگی کے لئے ان تعلقات کو حارج سمجھکر گریز کرتے رہے۔ مگر بالآخر مجبوراً نکاح ثانی کا ارادہ کیا۔ اور غالباً گونڈہ سے واپسی کے بعد بشورہ ڈاکٹر مصطفےٰ خانصاحب عقد ثانی کر نا طے کر لیا۔ یہ امر برادرم حاجی محمد حامد صاحب نعمانی کو ناگوار تھا۔ اس جذبہ کی ذمہ داری زیادہ تر خود مولانا کے گزشتہ طرز عمل پر تھی۔ کیونکہ خود مولانا اپنے باپ کی زندگی تک اپنی سوتیلی ماں کا نام سننا گوارہ نہ کر سکتے تھے۔ بہرحال مولانا نے نکاح ثانی کر لیا۔ حامد بھائی کو اس کا سخت صدمہ ہوا اور کچھ دنوں کے لئے گھر سے لاپتہ ہو گئے۔ اس وقت مولانا کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ گھنٹوں مسلسل رویا کرتے۔ بہرحال چند مہینوں کے بعد پتہ چلا کہ حامد صاحب زندہ ہیں اور بہار میں کسی صوفی صاحب کے مرید ہو کر زاہدانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مولانا کے چچازاد بھائی حاجی شیخ محمد عثمان صاحب اور ماموں زاد بھائی حاجی رشید الدین صاحب بھیجے گئے۔ اور حامد صاحب کو منا لائے۔

حیدرآباد میں مولانا کے قدرشناسوں کی کمی نہ تھی۔ طبقہ امرا میں نواب مدار المہام بہادر نواب وقار الامرا، مہاراجہ سرکشن پرشاد وغیرہ مولانا کی بڑی عزت کرتے تھے۔

ارباب مناصب میں دربار حیدرآباد کے فیضی و ابوالفضل یعنی مولوی سید حسین اور مولوی سید علی بلگرامی۔ مولانا کے بڑے معترف اور پایہ شناس احباب میں سے تھے۔ مولوی نظام الدین حسن صاحب جج، نواب سربلند جنگ۔ اور عزیز مرزا مرحوم سے برادرانہ و عزیزانہ تعلقات تھے۔ مولانا حیدرآباد پہنچے تو بڑا پرجوش خیر مقدم ہوا۔ ایک بڑے جلسہ میں جس کے صدر خود وزیر صاحب محکمہ عدالت تھے مولانا نے تقریر فرمائی۔ نواب مدار المہام صاحب کی خدمت میں باریابی ہوئی تو انھوں نے مولانا کو قیام حیدرآباد کی ترغیب دی۔ پہلے امور مذہبی کی ایک بڑی خدمت مولانا کو دینی چاہی مگر مولانا نے انکار کیا تو بالآخر ۲ر جمادی الاولیٰ ۱۳۱۶ھ لغایۃ ۱۹۰۱ء میں سررشتہ علوم و فنون کے نظامت کا پروانہ ملا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ سر انٹنی میگڈانلڈ صوبہ متحدہ کے لفٹنٹ گورنر ہو چکے تھے۔

مسلمانوں کے ساتھ عموماً اور اردو کے ساتھ خصوصاً ان کی دشمنی ضرب المثل ہے۔ انھیں کے زمانہ میں بہار سے اردو کا اخراج ہوا اور انھیں کی حکومت میں صوبہ متحدہ سے بھی اردو کو مٹانے کی کوشش شروع ہوئی۔ منشی اطہر علی صاحب علوی مرحوم جو کاکوری کے رئیس لکھنؤ کے مشہور وکیل تھے اور ندوۃ العلماء کے بڑے سرپرست تھے، اپنی مذہبیت اور اسلام دوستی کی بنا پر معتوب ہوئے اور ان کے تعلق سے ندوہ بھی معتوب ہو گیا۔ مجبوراً منشی صاحب نے لکھنؤ چھوڑا۔ اور بالآخر ہجرت کی غالباً میکڈانلڈ صاحب کی یہی اسلامی خدمات تھیں جس کے اعتراف میں علی گڑھ کا ایک بورڈنگ ہاؤس ان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا کہنا یہ تھا کہ سر انٹنی میکڈانلڈ کی اینٹی اردو پالیسی نے اکثر مسلمانوں کو مشتعل کر دیا اور اردو کی حمایت و ترقی پر متوجہ کیا۔ مولوی منیر الدین صاحب اڈیٹر البشیر اور نواب محسن الملک نے ایک سلسلہ مضامین لکھا۔

(باقی)

تفسیر سورہ کافرون

استاذ امام مولانا حمید الدین رحمہ اللہ کی تفسیر سورہ کافرون کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں ہجرت، اور براءت کا اصلی فلسفہ بیان کیا گیا ہے اور نبوت کے مراحل و مقامات کی توضیح اسقدر حکیمانہ انداز میں کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی بے شمار مشکلات آپ سے آپ حل ہو گئی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ عمدہ، حجم ۴۸ صفحہ۔ تقطیع $\frac{۲۰×۳۰}{۱۶}$۔

"منیجر"

ادبیات

نذر عقیدت

از جناب مرزا احسان احمد صاحب وکیل اعظم گڑھ

اے حریم قدس، اے خاک حجاز
سجدہ گاہ قدسیان بزم راز
جلوہ گر ہے تجھ میں وہ برق حیات
جس کے پرتو سے ہے روشن کائنات
چپہ چپہ ہے ترا خلد بریں
نزہت انگیز و لطافت آفریں
ہے ترا ہر گوشۂ دامان خاک
پرتو نور ازل سے تابناک
ذرہ ذرہ تیرا برق طور ہے
بزم ہستی جس سے غرق نور ہے
آستانہ ہے ترا وہ آستاں
جس کی عظمت پر تصدق لامکان
وہ تلاطم ہے ترے آغوش میں
غرق ہے کونین جس کے جوش میں
بندۂ فرمان تری جبروت کا
ذرہ ذرہ عالم لاہوت کا
یہ ترا صحرائے بے نقش و نگار
حسن فطرت کی ہے معراج بہار
سادگی جس کی چمن پیرائے کون
طرۂ آرائش سیمائے کون
تیرے ریگستان کا سوز و گداز
ہے نشاط روح ارباب نیاز
جس کا ہر ذرہ شرار معنوی،
مشعل ایمان و شمع آگہی
ہے تری یہ وادی بے آب و کشت
انبساط سرمدی کی اک بہشت

جس کے ہر منظر پہ ہے چھایا ہوا   ایک عالم کیف نامحدود کا
جس کے آغوشِ فضا میں جلوہ بار   آفتابِ رحمتِ پروردگار
جس کے دامن میں ہے وہ قصاں حرم   جس کا نظارہ ہے معراجِ نگاہ
کوہِ فاراں ہے یہ وہ جلوہ زار   جس پہ نورِ وادیٔ ایمن نثار
چوٹیوں سے جس کی اٹھی وہ صدا   ہل گئی ایوانِ باطل کی بنا
جس کے دامن سے اٹھی وہ موجِ نور   مٹ گئی تاریکیٔ کفر و غرور
وادیوں سے جس کی وہ ابرِ کرم   اٹھ کے برسا بن گئی دنیا ارم
جس کے قطروں میں تھا وہ نورِ حیات   ہو گئی شاداب کشتِ کائنات
آتشِ شر سرد ہو کر رہ گئی   لہلہا اٹھا ریاضِ معنوی
شرق سے تا غرب پھر برپا ہوا   غلغلہ توحیدِ ابراہیم کا
روح پھر لذت کشِ عرفاں ہوئی   دل کو حاصل دولتِ ایماں ہوئی
وہ شبستاں ہے ترا غارِ حرا   خاک جس کی سجدہ گاہِ مصطفیٰ

جس میں نازل نورِ یزدانی ہوا   واردِ الطافِ روحانی ہوا
جس میں وہ شمعِ یقیں روشن ہوئی   بزمِ عقل و جان و دیں روشن ہوئی
جس کی ضو نے جسم کو جاں کر دیا   دیدۂ باطل کو حیراں کر دیا
جس میں لے کر مژدۂ تکمیلِ دیں   عرش سے نازل ہوئے روح الامیں
آفتابِ حق ضیا گستر ہوا   غرقِ ظلمت کفر کا منظر ہوا
عدل کو فرمانِ دارائی ملا ...   ظلم کو پیغامِ رسوائی ملا
بانگِ حق سے گونج اٹھے دشت و جبل   ہو گئی خم گردنِ لات و ہبل

گمرہوں کو جادۂ منزل ملا
بے حسوں کو اضطرابِ دل ملا
تشنہ کاموں کو ملا جامِ حیات
دردمندوں کو ملی غم سے نجات
دل کی تسکیں روح کی راحت ملی
یعنی وہ توحید کی دولت ملی
جس نے بخشا فقر کو تاجِ شہی
جہل کو دی جس نے شمعِ آگہی
جس کے دم سے بن گئے صحرا نشیں
محرمِ اسرارِ جبریل امیں
وحشیوں کو جس نے دیں وہ ہمتیں
کج کلاہی کی مٹا دیں شوکتیں
جس نے دی تیرہ دلوں کو روشنی
مفلسوں کو کر دیا جس نے غنی
جس نے نظریں مال و زر سے پھیر دیں
سلطنت کے جاہ و فر سے پھیر دیں
جس کے فیضانِ اثر سے بن گئے
اہلِ دنیا کی امامت کے لیے
وہ کہ تھی جن کو خدا سے دشمنی
شیوۂ فطرت تھا جن کا رہزنی
نشۂ قوت سے جس کے ہو کے مست
دی غلاموں نے امیروں کو شکست
رومیوں کی چھین لی تیغ و سناں
روند ڈالا طرۂ تاجِ کیاں
جس نے بخشا امیوں کو وہ شعور
ہو گئے سر تا قدم معمورِ نور

بن گئے وہ درس آموزِ ملک
کھل گئے سب ان پہ اسرارِ فلک

NATIONAL MUSLIM

تقریظ و تبصرہ

"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش"

(۲)

بہرحال مولانا کا یہ خیال کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ جس جماعت نے مسلمانوں کے حقوق و مفاد کا نام لیا ہم نے اسکا سینہ "فوڈیت" اور "رجعت پسندی" کے طعنوں سے چھلنی کرنا شروع کر دیا۔ ان لفظوں کی ایک سیاسی تاریخ ہے اور روایت اور استعمال نے انکا جو مفہوم متعین کر دیا ہے ہم اس سے ایک انچ بھی منحرف نہیں ہوئے ہیں۔ ہم رجعت پسند انہی لوگوں کو کہتے ہیں جو رجعت پسند ہیں۔ اور وقت کے ہر تقاضے اور ضرورت کے ہر مطالبہ کا جواب جن کے پاس صرف یہ ہے کہ اس سے منہ پھیر لیں۔ اپنی موجودہ حالت میں کسی طرح کی تبدیلی کیلئے آمادہ نہ ہوں اور جب دیکھیں کہ سیلاب کی کوئی زور دار رو ان کے دار الامان کی دیواروں سے بھی ٹکرائی تو چلانے اور شور مچانے لگیں کہ دوڑو دوڑو تمہارا مذہب، تمہاری تہذیب اور تمہاری ساری روایات خطرہ میں آگئی ہیں۔ اور جب اس جاذب قلوب و ارواح صدا کی تسخیر سے کچھ سادہ دلوں کو اپنے ارد گرد جمع کر لیں تو اطمینان کا سانس لیں کہ اب آئی ہوئی آفت گذر گئی اور ڈوبتا ہوا سفینہ بچا لیا گیا۔

مولانا سیاست اور تاریخ کی ان کتابوں کو دیکھیں جن میں ان لفظوں کی تاریخ بیان ہوئی ہے اور پھر غور فرمائیں کہ ہم نے ان کے صحیح منطوق کی تعیین میں کتنی دیانت داری سے کام لیا ہے۔ اب اتفاق کی بات ہے کہ اس رائے میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی ہمارے ہم آہنگ ہو گئے ہیں اسلئے ہم پر اندھی تقلید اور ہندوؤں کے پروپگنڈے سے مسحور ہونے کا الزام ہے لیکن صد شکر کہ اسکی تائید میں ایک صدا دار الاسلام سے

ی اٹھی (جس کی تفصیل پچھلی اشاعت میں گزر چکی ہے۔) اس لئے امید ہے کہ اب یہ گناہ ثواب ہو جائیگا۔ اور تقلید و اتباع امیانہ کی جگہ اسکو اجتہاد و تفقہ عالمانہ سے تعبیر کیا جائیگا۔ مصداق ہرچند ایک ہی ہو لیکن جب اس کا قائل بدل گیا ہے اس کی حقیقت بھی ان شاء اللہ بدل کے رہے گی۔

غرض جہاں تک ٹوڈیت اور رجعت پسندی کے نعروں اور ہنگاموں کا تعلق ہے الحمدللہ اب ہم میں، مولانا میں اور پنڈت ہرلال نہرو میں اتفاق معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے بعد پھر اختلاف رائے شروع ہو جاتا ہے۔ وہ "دارالاسلام" قائم کر کے حتیٰ یطوا الجزیۃ عن ید وہم صاغرون" کی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ اور کانگریسی مسلمان "مسلمانوں کی شدھی" اور ان کا ماکاٹے میں مشغول ہو جاتے ہیں یہ ایک اہم اور عظیم اختلاف ہے جس کے وجوہ و اسباب پر ہم کو مفصل بحث کرنی پڑیگی۔ لکن فی الحال ہم پیش نظر کتاب کے زیر نظر صفحات پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں اس بحث کیلئے ہم اس وقت رغ ہوں گے جب مولانا کی اصل اسکیم "دارالاسلام" پر غور کریں گے۔

اس تمہیدی بحث کے بعد مولانا نے تین فصلوں میں 'قوم پرستوں کے نظریات' کی تشریح کی ہے۔ اور اس فر تحقیق میں انکو "خوش قسمتی" سے جو عجیب و غریب ماخذ دلائل و معلومات کیلئے، ہاتھ لگ گیا ہے اسکا ذکر ان لفظوں میں فرماتے ہیں۔

> "خوش قسمتی سے ہمارے پاس ایک کتاب ایسی موجود ہے جس میں ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلے اور اس کے حل اور ہندوستان کی آزاد حکومت کے نقشے اور اس کے طریق حصول کے متعلق "قوم پرست" جماعت کے نظریہ کی پوری تشریح مل جاتی ہے۔ یہ کتاب پنڈت جواہرلال نہرو کی تصنیف ہے۔ جو نہ صرف کانگریس کے صدر رہ چکے ہیں بلکہ گاندھی جی کے متوقع جانشین سمجھے جاتے ہیں۔"

آپ کچھ سمجھے کہ یہ عجیب و غریب کتاب جو مولانا کو 'خوش قسمتی' سے ہاتھ آگئی ہے، جس میں ہندوستان کے بین الاقوامی ئلہ کا حل" ہندوستان کی آزاد حکومت کا نقشہ"، اس کے حصول کے متعلق "قوم پرست جماعت کے نظریہ کی پوری تشریح" ہی جگہ موجود ہے، کیا ہے؟ مصنف کا نام تو مولانا نے بے تکلف بتا دیا ہے اور اس کا عہدِ حال و مستقبل بھی ظاہر یا ہے لیکن معلوم نہیں کتاب کا نام کس مصلحت سے یہاں ظاہر کرنا مناسب نہیں خیال فرمایا۔ حالانکہ اگر وہ صاف لفظوں

میں لکھدیتے کہ اسکا نام "میری کہانی" ہے جیسے پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنی آپ بیتی لکھی ہے تو اس سے ان کے پیش نظر مقصد کیلئے کسی ہندو کا اندیشہ نہیں تھا۔ مولانا ادھر عرصے سے جس رنگ پر اپنے قارئین کی تربیت فرمارہے ہیں اس کے فیض سے انشاء اللہ اب وہ پوری طرح اس قابل ہو گئے ہیں کہ اس طرح کے دعاوی و دلائل میں کوئی بیگانگی نہ محسوس کریں۔ وہ نہایت آسانی سے اس بات کو باور کر سکتے ہیں کہ اگر جواہرلال نے کسی کتاب میں فلاں فلاں باتیں لکھ ہیں تو یقیناً وہی ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلہ کا حل ہے۔ وہی ہندوستان کی آزاد حکومت کا نقشہ ہے۔ وہی تمام قوم پرست جماعت کے نظریہ کی تشریح ہے۔ وہی کانگریس کی سرکاری پالیسی ہے، وہی پٹیل، گاندھی، راجندر اور تمام ہندو سوچ رہے ہیں۔ اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد، اور مولانا سید سلیمان ان خیالات و افکار کے علاوہ کچھ سوچ سمجھ سکیں جو اس عجیب وغریب کتاب میں بیان ہوئے ہیں کہ انکا تو مقصد زندگی ہی یہی ٹھہرا کہ جواہرلال جو کچھ املا کرادیں وہ لوح قلب وحافظہ پر نقش کرلیں اور پھر اس کو مضمونوں، اخباروں اور تقریروں میں دہراتے رہیں۔ اور انہی کے ساتھ یہ گردن زدنی اڈیٹر الاصلاح بھی ہے جو قرآن کا لیبل لگا کر جواہر لال کی بولی ہوئی بولیاں براڈکاسٹ کرتا رہتا ہے۔

ابنائے زمانہ کا طریقہ فکر و نظر یہی ہے۔ جو شخص بھی آج کانگریس پر تنقید کرنے کا شائق ہے وہ ہر راہ چلتے کے قول وفعل کو کانگریس کی سرکاری پالیسی کی حیثیت سے دیکھتا ہے اور اسی نقطہ نظر سے اس سے نتائج و اصول مستنبط کرتا ہے۔ مولانا نے اس حد تک گرنا تو پسند نہیں کیا ہے لیکن چلے وہ بھی اسی روش عام پر ہیں۔ یعنی ایک جمہوری ادارہ کے کانسٹی ٹیوشن، اس کے نظام کار، اس کے اغراض ومقاصد کو سمجھنے کیلئے وہ اس امر کو کافی سمجھتے ہیں کہ اس ادارہ سے وابستہ رہنے والے کسی شخص کی سوانح عمری پڑھ لیں اور پھر اسی کے ذاتی جذبات وخیالات اور افکار ومعتقدات کے اندر اس ادارہ کے خط وخال بھی دیکھ لیں حالانکہ یہ اصول نہ صرف یہ کہ نہایت غلط ہے بلکہ اسکی تعمیم متعدی ہونے کی حالت میں نہایت خوفناک بھی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ادارہ کے تمام افراد صرف اپنی مشترک پالیسی ہی کے ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ اس ادارہ سے وابستگی رکھنے والے تمام اشخاص وافراد کے ذاتی خیالات و

و معتقدات کے بھی ذمہ دار ہوں۔ سب کو معلوم ہے کہ مولانا حسرت اشتراکی ہیں اور اشتراکیت ہی میں وہ ہندوستان کی نجات دیکھتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ لیگ کے ایک وفادار کارکن بھی ہیں، پھر کیا کسی شخص کو بھی حق ہے کہ وہ مولانا کے ذاتی خیالات کی روشنی میں لیگ کی اصلی پالیسی کا رجحان معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ ہمارے قائد اعظم مسٹر جناح کا ذاتی فیصلہ یہ ہے کہ نکاح و طلاق وغیرہ کے معاملات ہ مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے، پھر کیا ان کے ذاتی خیال کی ذمہ داری ہم اپنے ان مشائخ پر لوٹا دیں جن پر اللہ تعالیٰ نے الہام فرمایا ہے کہ مسلم لیگ حق ہے حالانکہ اگر پنڈت جواہر لال کے خیالات محض اس بنیاد پر کانگریس کی سرکاری پالیسی قرار دیئے جا سکتے ہیں کہ وہ کانگریس کے دو سال متواتر صدر رہ چکے ہیں اور گاندھی جی کے متوقع جانشین ہیں تو مسٹر جناح کے اعمال و معتقدات بدرجہ اولیٰ لیگ کی سرکاری پالیسی اور اس کے منتہائے مقصود قرار دیئے جا سکتے ہیں کہ وہ اس کے "عین حیاتی صدر" ہیں اور ہماری قوم کے "متوقع امیر المومنین" یا علی الاقل "منتظر مصطفےٰ کمال"

مولانا معاف فرمائیں مجھے ان پر اعتراض کرنے اور ان کے خیالات کی تحقیر کا کوئی شوق نہیں ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ سطریں کتنے قلق و اندوہ کے ساتھ و بے دلی اور افسردگی کے کیسے بھاری پتھر کے نیچے دبا ہوا لکھ رہا ہوں۔ میں ان کے خلوص اور قابلیت دونوں کا سچے دل سے معترف ہوں اور ان کے کاموں کی کامیابی کا دل سے متمنی لیکن وہ خدارا انصاف کو راہ دیں اور سوچیں کہ انھوں نے "مطعون" "قوم پرستوں" کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کیلئے کتنی غلط راہ اختیار کی ہے اور بحث و تحقیق کی راہ میں ان کا پہلا ہی قدم کتنا غلط اٹھا ہے۔ جو لوگ کانگریس کے ہمدرد ہیں وہ کانگریس کے اصولوں کے ہمدرد ہیں اور کانگریس کے اصولوں اور کاموں کی تفسیر جواہر لال کی آپ بیتی اور گاندھی جی کی تلاش حق میں نہیں ہے۔ اس کے لئے کانگریس کا کانسٹی ٹیوشن، اس کی تجاویز کا دفتر، اس کے کاموں کی تاریخ، اس کے منصوبوں کا نقشہ موجود ہے۔ مولانا اس کا جائزہ لیں اور پھر اس کی روشنی میں قوم پرستوں کے نقطہ نظر کو سمجھیں اور جی چاہے تو اس کی بنا پر مورد عتراض اور ہدف مطاعن بنائیں۔ باقی رہے اشخاص و افراد کے ذاتی عزائم و اعمال تو جواہر لال تو صرف شتراکی ہونے کے مجرم قرار دیئے جا سکتے ہیں اور

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

کانگریس کے اندر تو ان کو ایسے اشخاص بھی مل جائیں گے جن کے ہزار ارادوں میں سے اگر ایک ارادہ کو بھی اللہ تعالیٰ پورا ہونے کی مہلت دیدے تو وہ ہندوستان کو جہنم بنا دیں۔ لیکن یقیناً ان کا ارادہ کانگریس کی پالیسی کی حیثیت نہیں رکھتا۔ اور نہ اسکی ذمہ داری تمام "قوم پرستوں" پر عائد کی جاسکتی۔

بہرحال اس کتاب میں انھوں نے قومیت، مذہب، اور اقتصادی تنظیم کے متعلق پنڈت جواہر لال کے خیالات نقل کئے ہیں اور پھر اسی سلسلہ میں بابو سمپورنانند، ڈاکٹر اشرف، اور منظر رضوی وغیرہ کی طول طویل عبارتیں نقل کی ہیں۔ حالانکہ اس تطویل لاطائل کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہ تمام حضرات اشتراکی گروپ کے لوگ ہیں، ان کے نزدیک ہر چیز کی بنا اقتصادی توازن پر ہے۔ مذہب، سوسائٹی اور قومیت کے متعلق ان کے نظریات کوئی سر مخفی نہیں۔ ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے۔ پس اس ساری بحث کو ایک جملہ میں سمیٹا جاسکتا تھا کہ کانگریس میں فلاں فلاں اشخاص اشتراکی ہیں۔ اور اس تحریر کی بھی چنداں ضرورت نہ تھی۔ ہر پڑھے لکھے آدمی کو یہ بات معلوم ہے اور جو لوگ کانگریس کے اندر ہیں وہ شاید اس سے زیادہ وسعت و تحقیق کے ساتھ جانتے ہیں جتنی وسعت کے ساتھ مولانا نے اس کو پیش کیا ہے۔

ہم کو یہ بھی تسلیم ہے کہ ان لوگوں کے پیش نظر ایک ایسی قومی حکومت کا قیام ہے جو مذہبی قومیتوں کو مٹا کر قومی بنائی جائے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ لوگ مذہبی عقائد کے بجائے معاشی عقائد کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی اندیشہ بجا ہے کہ جو اقلیت اس معاشی مذہب کی پیروی نہ کرے اس کو ڈرا کر دھمکا کر یہ لوگ انقلاب پیدا کریں گے۔ پھر ان سب کے آخر میں اس خطرہ کا بھی امکان ہے کہ ہندوستان میں جب بین الاقوامی اشتراکیت کا علم بلند ہو اس کی ٹکر سب سے پہلے اس بین الاقوامی نظام اجتماعی سے ہو جو ہندوستان کی ہمسایہ ممالک میں پھیلا ہوا ہے یعنی اسلام۔ یہ تمام خطرات بجا و درست، اور ہم بے سوچے سمجھے ان کو تسلیم کئے لیتے ہیں لیکن کانگریس سے ان کا پیوند کیا ہے؟ یہ کانگریس کے اندر کے ایک گروپ کے خیالات ہیں یا کانگریس کی سرکاری پالیسی کی حیثیت رکھتے ہیں؟ یہی سوال اس بحث میں بنیادی سوال ہے؟ اس کا جواب مولانا کی زبان سے سنئے۔ مولانا فرماتے ہیں:-

' پنڈت جواہر لال کے جو خیالات گزشتہ صفحات میں پیش کئے گئے ہیں ان کو محض ایک شخص کے ذاتی

خیالات کہکر سرسری طور پر نظر انداز کر دینا صحیح نہیں ہے۔ اول تو یہ اس شخص کے خیالات ہیں جو گاندھی جی کے بعد کانگریس میں سب سے زیادہ با اثر ہے اور دو مرتبہ کانگریس کا صدر رہ چکا ہے دوسرے یہ کہ جواہر لال کے بعد اس کے ہم خیال بلکہ ان سے زیادہ سخت خیالات رکھنے والے شخص سوبھاش چندر بوس کا صدر منتخب ہونا اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ کانگریس پر ان خیالات کا پورا غلبہ ہے۔ ان سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اب یہ خیالات لیڈروں کے ذاتی خیالات نہیں رہے بلکہ درحقیقت کانگریس کی سرکاری پالیسی کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔"

یہ عبارت زیر نظر کتاب کے صفحہ ۱۴۴ سے ماخوذ ہے اب اسی کے ساتھ صفحہ ۱۷۶ کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ فرمایئے اور اس تطابق بیان پر سر دھنیے۔

"کانگریس کے متعلق یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ اس کا نصب العین اشتراکی نہیں ہے۔ نہ وہ سرمایہ داروں سے بگاڑنا چاہتی ہے۔ نہ سرمایہ داری نظام کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ نہ اس سماجی (تمدنی) انقلاب کی حامی ہے جس کا ذکر جواہر لال اور سوبھاش چندر بوس بار بار کیا کرتے ہیں۔ ہری پورہ کانگریس میں جواہر لال کے سامنے اور سوبھاش چندر بوس کی صدارت میں سردار نبھ بھائی پٹیل نے سوشلسٹ جماعت کو بری طرح ڈانٹا تھا اور یہ الفاظ کہے تھے۔

> "تم کانگریس میں دست راست اور دست چپ کی جماعتیں پیدا کرنے کے ذمہ دار ہو حالانکہ کانگریس ہمیشہ سے ایک وحدت رہی ہے . . . ہم برابر دو سال سے تمہارے وجود کو برداشت کر رہے ہیں مگر وہ وقت آ رہا ہے جب ہم تمہیں برداشت نہ کر سکیں گے۔" (ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۳۸ء)

اس زبردست توبیخ پر ہندوستانی اشتراکیت کے ان دونوں اقنوموں میں سے ایک نے بھی دم نہ مارا۔ کانپور، حیدرآباد اور دوسرے مقامات پر مزدوروں کا سر خود کانگریسی وزارتیں ہی کچلتی رہی ہیں۔ مدراس، صوبہ سرحد اور دوسرے صوبوں میں جہاں کہیں اشتراکیوں نے چادر سے پاؤں نکالا وہاں کانگریسی حکومتوں نے ہی ان کی سرکوبی کی ہے۔

ابھی چند ہی روز ہوئے ہیں کہ حکومت مدراس نے اشتراکیت کی تبلیغ کے خلاف ایک کیونک شائع کیا ہے جس میں وہ لکھتی ہے کہ:-

"چند پمفلٹ جو ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے شائع کئے جا رہے ہیں، حال میں حکومت کے ہاتھ آئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پارٹی ہمہ گیر گڑبڑی جاری ہے اور اس ملک میں ابتری پھیلانا چاہتی ہے اسلئے حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے کہ پبلک کو اس سے متنبہ کر دے تاکہ عام باشندگان ملک نادانستگی میں ایسی تحریک سے متاثر نہ ہو جائیں جس کا فلسفہ اور طریق کار بالکلیہ اس ملک کی تہذیب اور روایت کے خلاف ہے۔"

اس کے بعد اس کیونک میں اشتراکی پمفلٹوں کا خلاصہ دیا گیا ہے جس کے یہ الفاظ خاص طور پر غور طلب ہیں۔

"محنت کش طبقوں کی انقلابی فوج یعنی ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی اس ملک میں طبقہ وار جنگ برپا کرے گی اور قومی انقلابی ہڑتال کا اعلان کرے گی، کاریگر اپنے اوزار رکھ دیں گے۔ دماغی کام کرنے والے دفتروں سے نکل آئیں گے۔ طلبہ مدرسوں سے سڑکوں پر آ جائیں گے کسان مالگزاری اور لگان دینے سے انکار کر دیں گے، ریلیں کھڑی ہو جائیں گی، کارخانے اور بجلی گھر بند ہو جائیں گے۔" (ملاحظہ ہو اخبار رہبر دکن مورخہ ۲۰ر اگست ۳۵ء) (ترجمان)

یہ پوری عبارت بغیر کسی اقتضاب و تصرف کے صفحات ۱۶۷ اور ۱۶۸ سے نقل کی گئی ہے۔ احباب جانتے ہیں کہ حوالے نقل کرنے اور عبارتیں پیش کرنے سے مجھے وحشت ہوتی ہے اور یہ میرا طریقہ نہیں۔ تاہم دل پر جبر کر کے یہ طویل اقتباس پیش کرتا ہوں تاکہ لوگ ان دونوں عبارتوں کے تضاد کو دیکھ سکیں کہ آدمی اگر کسی کے لئے نامنصف ہو جائے تو اس کے متعلق ایک ہی سانس میں کس قدر مختلف اور متضاد باتیں کہنے کی اس میں کیسی حیرت انگیز قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر میں مولانا کو معذور سمجھتا ہوں وہ طول بیان کا جو جال دوسروں کے لئے بنتے ہیں، بسا اوقات اس میں خود الجھ کے رہ جاتے ہیں۔ تحریروں کو عوام میں موثر بنانے کیلئے تطویل ناگزیر ہے اور عوام میں اتنا حافظہ اور علم کہاں کہ اشہب قلم

کی ان لغزشوں کو سمجھیں اور شمار میں رکھیں۔

بہرحال ایک طرف یہ یاد رکھئے کہ

"یہ خیالات (یعنی اشتراکی خیالات) لیڈروں کے ذاتی خیالات نہیں رہے بلکہ درحقیقت کانگریس کی سرکاری پالیسی کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں"۔

دوسری طرف یہ یاد رکھئے کہ

"کانگریس کے متعلق یہ بات روز روشن کیطرح عیاں ہو چکی ہے کہ اسکا نصب العین اشتراکی نہیں ہے"۔

ایک طرف جواہر لال کا درجہ کانگریس میں یہ ہے کہ

"جو گاندھی جی کے بعد کانگریس میں سب سے زیادہ بااثر ہے اور دو مرتبہ کانگریس کا صدر رہ چکا ہے"۔

دوسری طرف جواہر لال اور بوس دونوں کی بے بسی اور ناتوانی کا یہ حال ہے کہ پٹیل بر سر اجلاس اشتراکیوں کو ڈانٹتے ہیں اور اس زجر و توبیخ پر ہندوستانی اشتراکیت کے ان دونوں اقنوموں میں سے ایک نے بھی دم نہ مارا۔

ایک طرف یہ یاد رکھئے کہ "اشتراکیت کانگریس کی سرکاری پالیسی کی حیثیت اختیار کر چکی ہے"۔

پھر حافظے کے اسی گوشہ میں یہ بھی محفوظ رہے کہ "متعدد مقامات پر مزدوروں کا سر خود کانگریسی وزارتوں نے کچلا۔ متعدد صوبوں میں جہاں کہیں اشتراکیت نے چادر سے پاؤں نکالا وہاں کانگریسی حکومتوں نے ان کی سرکوبی کی۔ مدراس کی حکومت نے اشتراکیت کے خلاف باضابطہ کمیونک نکالا"۔ وغیرہ وغیرہ۔

پھر آیئے اور دیکھئے ان بکھرے ہوئے موتیوں کو مولانا کس مہارت و کاردانی کے ساتھ ایک لڑی میں پرو کر کانگریس کے گلے میں ڈال دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

"یہ ٹھیک وہی خیالات ہیں جو کانگریس سکرٹریٹ کے دفتر سے منظر رضوی صاحب شائع کر چکے ہیں۔

مولانا کا اشارہ ان خیالات کی طرف ہے جنکا مدراس گورنمنٹ نے اپنی کمیونک میں حوالہ دیکر اسکی سرزنش کی ہے)

"مگر یہ عجیب بات ہے کہ جب یہ خیالات مسلمانوں میں پھیلائے جاتے ہیں تو ان کو جائز رکھا جاتا ہے اور جب

> حقیقت میں ملک کے اندر اشتراکی انقلاب برپا کرنے کیلئے انکی اشاعت کی جاتی ہے تو کانگریسی حکومت ان کو ہندوستان کی تہذیب اور روایات کے منافی قرار دیتی ہے اور ان کے خلاف تہدیدی کمیونک نشر کرنا ضروری سمجھتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اشتراکیت فی الواقع کانگریس کی سرکاری پالیسی نہیں بلکہ خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں میں اس مسلک کو صرف اس غرض سے پھیلایا جارہا ہے کہ اسلامی سوسائٹی کے درہم برہم کرنے کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں۔“

اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ کس حیثیت سے اشتراکیت کانگریس کی سرکاری پالیسی ہے اور کس حیثیت سے نہیں ہے۔ مولانا کے نزدیک اشتراکی انقلاب کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) ایک حقیقت میں (۲) دوسرا مسلمانوں میں۔ کانگریس پہلے کی دشمن ہے مگر دوسرے کیلئے وہ مسلمان سپاہیوں کی فوج بھرتی کرتی ہے۔ اور اس امر کی پوری ہوشیاری کے ساتھ نگرانی کرتی رہتی ہے کہ یہ سپاہی ٹھیک کام کرتے ہیں یا نہیں؟ اگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی نوآموز سپاہی کے پھوہڑپن سے ”مسلمانوں میں“ والا انقلاب ”حقیقت میں“ والا انقلاب ہوجاتا ہے تو کانگریس کیمپ میں بڑی کھلبلی مچ جاتی ہے اور کانگریس گورنمنٹ اس کے خلاف تہدیدی کمیونک نکالتی ہے چنانچہ اسی قسم کا بڑا ہنگامہ منظر رضوی صاحب سے ہوگیا تھا، ان سے چاہا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں میں اشتراکی انقلاب پیدا کریں مگر انھوں نے پیدا کردیا حقیقت میں انقلاب۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ مدراس گورنمنٹ بروقت متنبہ ہوگئی ورنہ انھوں نے تو کانگریس کے گھر ہی میں آگ لگادی تھی مولانا نے ایک جگہ منظر رضوی صاحب کی کانگریس سکریٹریٹ سے علیحدگی کا مسئلہ بھی چھیڑا ہے اور اس کے اسباب سے متعجبانہ لاعلمی ظاہر کی ہے لیکن اس صورت حالات کے سامنے آجانے کے بعد معاملہ صاف ہے۔ یقیناً وہ اپنے مفوضہ خدمت میں کچھ چابکدست نہیں ثابت ہوئے ہوں گے۔ اور وہ کیا، وہ تو غریب ابھی کوچہ اشتراکیت کے طفل کم سواد ہیں، اگر کانگریس سکریٹریٹ کو عالم برزخ سے خود کارل مارکس کی خدمات بھی حاصل ہوجائیں تو اس بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز راہ پر تو شاید انکے قدم بھی ڈگمگاجاتے۔ مولانا کے نزدیک اشتراکیت سنکھیا کی پڑیا ہے جس کو کانگریس مسلمانوں کو چپکے چپکے کھلا کر ختم

کردینا چاہتی ہے حالانکہ ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اشتراکیت کی اصلی خصوصیت "اشتراک" ہے۔ موت میں بھی اور زندگی میں بھی۔ یہ تو ایک آگ ہے، اگر کسی شہر کے ایک محلہ میں لگے گی تو سارا شہر اس کے لپیٹ میں آئیگا۔ اگر ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمان کانگریس کی مساعی سے اشتراکی ہوگئے تو ہندوستان کے ہندو مہاجن زمیندار اور دوکاندار جن سے کانگریس نے سازش کررکھی ہے، اپنی گدیوں پر بیٹھے نہیں رہ جائیں گے۔ پھر یہ کانگریسی لیڈر کتنے احمق ہیں کہ مسلمانوں کی موت کے ساتھ اپنی موت کو بھی دعوت دے رہے ہیں اور لطف یہ کہ اپنی قبر دونوں ہاتھوں سے کھود رہے ہیں۔ ایک طرف مسلمانوں میں اشتراکیت کا زہر پھیلانے کے لئے منظر رضوی اور ڈاکٹر اشرف وغیرہ کو خرید لیتے ہیں دوسری طرف ہندو دھرم کو تباہ کرنے کے لئے جواہر لال اور بوس جیسے دو "اقنوموں" کو چھوڑ رکھا ہے جنھوں نے ہزاروں نہیں لاکھوں ہندو نوجوانوں کو گمراہ کر ڈالا ہے۔ اگر حقیقتہً ان کارروائیوں کا اصلی مقصد صرف مسلمانوں کے خلاف ایک سازش ہے، جیسا کہ مولانا نے افشائے راز کیا ہے، تو ہم افسوس کے ساتھ کہیں گے کہ ہندو لیڈروں نے سخت نادانی کی ہے وہ جو سرنگیں مسلمانوں کو تباہ کرنے کیلئے تیار کررہے تھے اسنے خود انکی عمارتیں مسمار کر ڈالیں۔'

مولانا نے یہ تحریر اس وقت لکھی ہے جب حالات پر "شب حاملہ است فردا چہ زاید" کا نقاب پڑا ہوا تھا۔

مگر اب اس سازش کی شام کی صبح نمودار ہوچکی ہے۔ اور مولانا زیادہ بہتر طریقہ پر معاملات کو سمجھ سکتے ہیں کہ کانگریس نے مسلمانوں کو تباہ کرنے کیلئے سازش کے طور پر اشتراکیت اختیار کررکھی تھی یا سرکاری پالیسی کے طور پر؟ بوس نے الکشن لڑکر حقیقت کے چہرہ سے پردہ ہٹادیا۔ اب مولانا اس روشنی میں اپنے ان قیاسات پر نظر ثانی فرمائیں۔

مولانا نے کئی صفحوں میں اشتراکیت کے خطرات بیان کئے ہیں۔ "اس سے اسلامی سوسائٹی پارہ پارہ ہوجائیگی۔ اس سے مسلمانوں کے عوام دین سے قطعی بیگانہ ہوجائیں گے۔" اس سے عامہ مسلمین اسلامی وحدت کے تخیل سے خالی الذہن ہوکر فرد فرد بنجائیں گے"، اور ان سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ پڑوس کے اسلامی ممالک کا نظام اجتماعی بھی درہم برہم ہوجائے گا، یہ سب کچھ ہوجائے گا۔ مگر ان تمام خطرات کے باوجود مولانا نے اس کانگریس کی کوئی مدد نہیں کی جس نے بیک وقت ان تمام

خطرات سے لڑائی کی اور قلت اعوان و انصار کی وجہ سے اس کو میدان سے پسپا ہونا پڑا۔ اگر مولانا نے اس معرکہ میں کانگریس کی مدد کی ہوتی تو وہ ایک ایسی پارٹی کو برسر اقتدار آنے سے روک دیتے جو ان کے لئے اتنے عظیم و ہولناک خطرات کا فتح باب ہے! اسی لئے کانگریسی مسلمان کہتے ہیں کہ جو لوگ کانگریس میں شریک نہیں ہیں وہ مسلمانوں کے لئے بے شمار خطرات کو دعوت دے رہے ہیں!!

بہرحال کانگریس کے گذشتہ معرکۂ انتخاب صدارت نے مولانا کے تمام شبہات دور کر دیئے ہوں گے، اب یہ دونوں باتیں قطعی ہیں کہ نہ اشتراکیت مسلمانوں کے خلاف سازش کے طور پر کانگریس کے سامنے تھی نہ قومی پالیسی کے طور پر۔ اس انکشاف کے بعد تو غالباً اب مولانا محجوب ہوں گے کہ وہ کیوں کانگریس سے اتنے دنوں بدگمان رہے اور کیوں ایسا ہوا کہ انھوں نے اشتراکی کوچہ گردوں کو ملک کے سب سے بڑے طاقتور سیاسی ادارہ کی مشین پر قابض ہو جانے دیا۔ اگر جاپان اس کو برداشت نہیں کر سکتا کہ چین کے کسی حصہ میں اشتراکیت پھیلے۔ اگر اٹلی اور جرمنی اسپین میں اس لئے خون کی ندیاں بہا دیتے ہیں کہ وہاں سے جمہوریت کا تخم فساد کہیں سر نہ اٹھائے تو کتنے افسوس کی بات ہے کہ مولانا نے ایک ایسے دشمن کے خلاف کانگریس کی کوئی مدد نہیں کی جس کا اقتدار کانگریس اور دارالاسلام دونوں کے لئے مہلک ہے۔ مولانا غالباً اس سے بےخبر نہ ہوں گے کہ اگر ہندوستان کے ہندو اشتراکیت سے مغلوب ہو گئے تو مسلمانوں کے اردگرد کوئی ایسا طلسماتی خط نہیں کھینچا جا سکتا جو اشتراکیت کی آگ ان کے اندر پھیلنے سے روک دے۔ یہ آگ تو ایسی تیز ہے کہ ماسکو سے اڑ کر اسکی چنگاری ہندوستان پہنچتی ہے۔ پھر ایک ہی ملک کی مختلف قوموں میں اسکا پھیلنا کیا دشوار ہے جبکہ حالت یہ ہے کہ زمیندار مسلمان ہے تو کاشتکار ہندو، اور مکان دار ہندو ہے تو کرایہ دار مسلمان۔ اور سرمایہ داری کا یہ حال ہے کہ چند مسلمان اور تھوڑے سے ہندو دولتمند ہیں اور باقی سب وہی آشفتہ مغزوں اور کوچہ گردوں کی بھیڑ ہے۔

مولانا نے صرف کانگریس کو ملزم بنانے ہی میں ناانصافی سے کام نہیں لیا ہے بلکہ خود اپنی حالت سمجھنے میں بھی سخت غلطیاں کی ہیں۔ وہ اشتراکیت پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے ہمارا اجتماعی نظام درہم برہم ہو جائیگا۔

پھر اپنے موجودہ نظام اجتماعی کو عین اسلامی نظام اجتماعی سمجھ لیتے ہیں تو اس طرح اشتراکیت کی رو پر عین اسلام کو کھڑا کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اسلام نے جو نظام اجتماعی قائم کیا ہے ہمارا اعتقاد ہے کہ اس میں اشتراکیت کی در اندازی کے لئے کوئی منفذ نہیں ہے۔ اور آپ آج جس نظام اجتماعی کو اسلامی نظام اجتماعی کہہ رہے ہیں وہ اسقدر مسخ ہو اسلام سے ابعد ہے کہ اگر آپ اس کے گلے میں قرآن لٹکا دیں اور اس کے دروازے پر دو کروڑ بھی کھڑے کر دیں جب بھی اس کو اسلام کا کوئی جاننے والا، اسلامی نظام اجتماعی نہیں سمجھ سکتا اور کوئی نہیں ہے جو آج اس کو گرنے سے بچا سکے۔ مولانا لکھتے ہیں:۔

> "تمام وہ لوگ جو توحید اور رسالت محمدی کے قائل ہیں ایک ہی ہیئت اجتماعی میں شامل ہو جاتے ہیں خواہ ان میں سے ایک عثمان غنیؓ کی طرح سرمایہ دار ہو اور دوسرا ابوذر غفاریؓ کی طرح قلاش۔ اسی دینی وحدت کی بنا پر ان میں نماز کی جماعت سے لیکر شادی بیاہ تک ہر قسم کے معاشرتی اور تمدنی تعلقات ہوتے ہیں۔"

مولانا نے ان سطروں میں ان اشتراکیوں کا جواب دیا ہے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ غریب مسلمان ان مٹھی بھر دولتمندوں سے کسی طرح نہیں مل سکتے جو اپنی دولت کے مالک و متصرف لاشریک بنے بیٹھے ہیں۔ یہ دعویٰ غلط سہی مگر مولانا معاف فرمائیں انکا جواب غلط در غلط ہے۔ اول تو یہی بات صحیح نہیں ہے کہ تمام وہ لوگ جو توحید اور رسالت محمدیؐ کے قائل ہیں ایک ہی ہیئت اجتماعی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مانعین زکوۃ کے خلاف جہاد کیوں فرمایا ان لوگوں نے توحید اور رسالت کا انکار تو نہیں کیا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ توحید و رسالت کے اعتقاد کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ہماری ہیئت اجتماعی کی تشکیل میں دخل رکھتی ہیں، اور اگر کوئی جماعت انکا اعتقاداً یا عملاً انکار کر دے تو وہ ہماری ہیئت اجتماعی کو درہم برہم کر دیتی ہے اور ہمارے اور اس کے بیچ میں ایک خلیج حائل ہو گئی۔ مولانا بھول رہے ہیں کہ نماز کے ساتھ زکوۃ اور اعتقاد توحید کے ساتھ مرحمت اور ایمان کے ساتھ انفاق بھی دین کا اور اسی کے ساتھ ہماری ہیئت اجتماعی کا دوسرا ستون ہے۔ اور ہماری ہیئت اجتماعی کا نگارخانہ زیادہ تر اسی انفاق و مرحمت کے حسن و جمال سے پر رونق تھا۔ پس جن لوگوں نے مرحمت کے رشتہ پر مقراض چلا دی انفاق کا دروازہ بند کر دیا، زکوۃ کا عملاً انکار کر دیا انھوں نے اپنا دروازہ ہمارے لئے بند کر دیا۔ اب مولانا اگر کہتے ہیں کہ نواب سلیم پور اور راجہ محمود آبا

اور اگر غریب مسلمان سائیں دونوں ایک ہی ہیئت اجتماعی کے ممبر ہیں تو ہم انکی خاطر سے چاہے تھوڑی دیر کیلئے مان لیں مگر اس پر شاید مولانا کا دل مطمئن ہوگا نہ ہمارا دل مطمئن ہے۔ مولانا کہتے ہیں کہ "اسی دینی وحدت کی بنا پر ان میں نماز کی جماعت سے لیکر شادی بیاہ تک ہر قسم کے معاشرتی اور تمدنی تعلقات ہوتے ہیں۔" لیکن یہ واقعات کے بالکل خلاف ہے۔ آج تو ہر چیز کی بنا اقتصادی امتیازات ہی پر ہے، اسی لحاظ سے شادی بیاہ ہوتے ہیں، اسی پر معاشرتی تعلقات کی بنا ہے، یہاں تک کہ یہ اغنیا غریبوں کے ساتھ مسجدوں میں بھی نہیں آتے۔ پھر ایک غریب فاقہ کش اور ایک راجہ صاحب ایک ہی ہیئت اجتماعی کے ممبر کیسے ہوئے؟

مولانا نے حضرت عثمان غنی اور حضرت ابو ذر غفاری (رضی اللہ عنہما) کی مثال خوب دی۔ شاید انھوں نے ابو ذر غفاریؓ کے حالات نہیں پڑھے ہیں۔

حضرت ابو ذر غفاریؓ حضرت عثمان غنیؓ سے کب مطمئن ہوئے؟ وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر بن الخطابؓ کے زمانہ میں تو بیشک مطمئن رہے کہ انکا عہد اسلام کی سادگی اور مساوات و محبت کا روشن ترین زمانہ تھا اور ہر شخص اپنے مال و متاع کا صرف امین اور خازن تھا، مالک مطلق العنان نہ تھا، مگر حضرت عثمان غنیؓ کے عہد میں جب فتوحات بڑھیں، امرا میں شان و شوکت، سرمایہ داری اور عیش و تنعم کا ذوق پیدا ہوا۔ قصر و ایوان بننے لگے تو حضرت ابو ذر غفاری خاموش نہ رہ سکے اور وقت کے سرمایہ داروں کے خلاف انھوں نے اپنی صدائے نکیر بلند کی۔ انکا عقیدہ تھا کہ کسی مسلمان کے لئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کو ننگا بھوکا چھوڑ کر اپنے لئے دولت کا خزانہ جمع کرے۔ امیر معاویہؓ وغیرہ امرائے شام کہتے تھے کہ خدا نے اہل دول پر زکوۃ کا جو فرض عائد کیا ہے اس کے ادا کرنے کے بعد ہر قسم کی دولت جمع کرنے کا مسلمانوں کو اختیار ہے۔ آہستہ آہستہ اس اختلاف نے نزاع کی شکل اختیار کی۔ حضرت ابو ذر ان امرا کو علانیہ قرآن پاک کی اس آیت کا مورد ٹھہراتے تھے۔

والذین یکنزون الذھب والفضۃ	جو سونا اور چاندی جمع کر رکھتے ہیں اور اس کو اللہ کی
ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم	راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو ایک عذاب
بعذاب الیم	دردناک کی خوشخبری سنا دو۔

پھر اپنے موجودہ نظام اجتماعی کو عین اسلامی نظام اجتماعی سمجھ لیتے ہیں تو اس طرح اشتراکیت کی زد میں اسلام کو کھڑا کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اسلام نے جو نظام اجتماعی قائم کیا ہے ہمارا اعتقاد ہے کہ اس میں اشتراکیت کی دراندازی کے لئے کوئی منفذ نہیں ہے۔ اور آپ آج جس نظام اجتماعی کو اسلامی نظام اجتماعی کہہ رہے ہیں وہ اسقدر مسخ اور اسلام سے ابعد ہے کہ اگر آپ اس کے گلے میں قرآن لٹکا دیں اور اس کے دروازے پر کروبی بھی کھڑے کر دیں جب بھی اس کو اسلام کا کوئی جاننے والا، اسلامی نظام اجتماعی نہیں سمجھ سکتا اور کوئی نہیں ہے جو آج اس کو گرنے سے بچا سکے۔ مولانا لکھتے ہیں:-

> ”تمام وہ لوگ جو توحید اور رسالت محمدی کے قائل ہیں ایک ہی ہیئت اجتماعی میں شامل ہو جاتے ہیں خواہ ان میں سے ایک عثمان غنیؓ کی طرح سرمایہ دار ہو اور دوسرا ابوذر غفاریؓ کی طرح قلانچ۔ اسی دینی وحدت کی بنا پر ان میں نماز کی جماعت سے لیکر شادی بیاہ تک ہر قسم کے معاشرتی اور تمدنی تعلقات ہوتے ہیں۔“

مولانا نے ان سطروں میں ان اشتراکیوں کا جواب دیا ہے جو دعوی کرتے ہیں کہ غریب مسلمان ان مٹھی بھر دولتمندوں سے کسی طرح نہیں مل سکتے جو اپنی دولت کے مالک و متصرف لاشریک بنے بیٹھے ہیں۔ یہ دعویٰ غلط سہی مگر مولانا معاف فرمائیں انکا جواب غلط در غلط ہے۔ اول تو یہی بات صحیح نہیں ہے کہ تمام وہ لوگ جو توحید اور رسالت محمدیؐ کے قائل ہیں ایک ہی ہیئت اجتماعی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مانعین زکوۃ کے خلاف جہاد کیوں فرمایا۔ ان لوگوں نے توحید اور رسالت کا انکار تو نہیں کیا تھا؟ اس سے معلوم ہوا کہ توحید و رسالت کے اعتقاد کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ہماری ہیئت اجتماعی کی تشکیل میں دخل رکھتی ہیں، اور اگر کوئی جماعت انکا اعتقاداً یا عملاً انکار کر دے تو وہ ہماری ہیئت اجتماعی کو درہم برہم کر دیتی ہے اور ہمارے اور اس کے بیچ میں ایک خلیج حائل ہو گئی۔ مولانا بھول رہے ہیں کہ نماز کے ساتھ زکوۃ اور اعتقاد توحید کے ساتھ رحمت اور ایمان کے ساتھ انفاق بھی دین کا اور اسی کے ساتھ ہماری ہیئت اجتماعی کا دوسرا ستون ہے۔ اور ہماری ہیئت اجتماعی کا نگارخانہ زیادہ تر اسی انفاق و رحمت کے حسن و جمال سے پر رونق تھا۔ پس جن لوگوں نے رحمت کے رشتہ پر مقراض چلا دی، انفاق کا دروازہ بند کر دیا، زکوۃ کا عملاً انکار کر دیا انھوں نے اپنا دروازہ ہمارے لئے بند کر دیا۔ اب مولانا اگر کہتے ہیں کہ نواب سلیم پور اور راجہ محمود آباد

اور انکو غریب مسلمان سائیس دونوں ایک ہی ہیئت اجتماعی کے ممبر ہیں تو ہم انکی خاطر سے چاہے تھوڑی دیر کیلئے مان لیں مگر اس پر شاید مولانا کا دل مطمئن ہو گا نہ ہمارا دل مطمئن ہے۔ مولانا کہتے ہیں کہ "اسی دینی وحدت کی بنا پر ان میں نماز کی جماعت سے لیکر شادی بیاہ تک ہر قسم کے معاشرتی اور تمدنی تعلقات ہوتے ہیں"۔ لیکن یہ واقعات کے بالکل خلاف ہے۔ آج تو ہر چیز کی بنا اقتصادی امتیازات ہی پر ہے، اسی لحاظ سے شادی بیاہ ہوتے ہیں، اسی پر معاشرتی تعلقات کی بنا ہے، یہاں تک کہ یہ اغنیاء غریبوں کے ساتھ مسجدوں میں بھی نہیں آتے۔ پھر ایک غریب فاقہ کش اور ایک راجہ صاحب ایک ہی ہیئت اجتماعی کے ممبر کیسے ہوئے؟

مولانا نے حضرت عثمان غنی اور حضرت ابو ذر غفاری (رضی اللہ عنہما) کی مثال خوب دی۔ شاید انھوں نے ابو ذر غفاریؓ کے حالات نہیں پڑھے ہیں۔

حضرت ابو ذر غفاریؓ حضرت عثمان غنیؓ سے کب مطمئن ہوئے؟ وہ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر بن الخطابؓ کے زمانہ میں تو بیشک مطمئن رہے کہ انکا عہد اسلام کی سادگی اور مساوات و محبت کا روشن ترین زمانہ تھا اور ہر شخص اپنے مال و متاع کا صرف امین اور خازن تھا، مالک مطلق العنان نہ تھا، مگر حضرت عثمان غنیؓ کے عہد میں جب فتوحات بڑھیں، امرا میں شان و شوکت، سرمایہ داری اور عیش و تنعم کا ذوق پیدا ہوا۔ قصر و ایوان بننے لگے تو حضرت ابو ذر غفاری خاموش نہ رہ سکے اور وقت کے سرمایہ داروں کے خلاف انھوں نے اپنی صدائے نکیر بلند کی۔ انکا عقیدہ تھا کہ کسی مسلمان کے لئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کو ننگا بھوکا چھوڑ کر اپنے لئے دولت کا خزانہ جمع کرے۔ امیر معاویہؓ وغیرہ امرائے شام کہتے تھے کہ خدا نے اہل دول پر زکوۃ کا جو فرض عائد کیا ہے اس کے ادا کرنے کے بعد ہر قسم کی دولت جمع کرنے کا مسلمانوں کو اختیار ہے۔ آہستہ آہستہ اس اختلاف نے نزاع کی شکل اختیار کی۔ حضرت ابو ذر ان امرا کو علانیہ قرآن کی اس آیت کا مورد ٹھہراتے تھے۔

والذین یکنزون الذھب والفضۃ	جو سونا اور چاندی جمع کر رکھتے ہیں اور اس کو اللہ کی
ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم	راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو ایک عذاب
بعذاب الیم	دردناک کی خوشخبری سنا دو۔

امیر معاویہؓ کہتے تھے اس آیت کا تعلق یہود و نصاریٰ سے ہے۔ حضرت ابوذرؓ کہتے تھے کہ اس ک
تعلق مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں سے ہے۔

جب سرمایہ داری اور اشتراکیت (اسلامی اشتراکیت) کی یہ نزاع زیادہ بڑھی تو دنیا کے او
مقدس اشتراکی کے ساتھ وہی معاملہ ہوا جس کی توقع تھی۔ امیر معاویہؓ نے حضرت عثمان غنیؓ کو لکھا کہ ان کو مد
بلا لیجئے۔ اگر یہ شام میں رہے تو ایک فتنہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ وہ مدینہ میں آئے تو یہاں کی دنیا بھی بدلی ہو
پائی۔ جس سرزمین سے یہ صدائیں بلند ہو کر دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچیں تھیں اب اسی سرزمین میں یہ ص
نامانوس ہو گئی تھی ۔ لوگ تعجب سے آآکر حضرت ابوذرؓ کو دیکھتے جس سے تنگ آکر یا (باختلاف روایت) حض
عثمانؓ کے حکم سے ایک چھوٹے سے گاؤں ربذہ نامی میں جلاوطنی کی زندگی اختیار کی اور وہیں اس ع
میں جان دی کہ ان کی رفیقہ حیات اور ان کے خدا کے سوا کوئی شخص ان کے پاس نہ تھا۔

مولانا ان واقعات پر غور فرمائیں کہ یہ کس چیز کا ثبوت ہے۔ اس سے مولانا کے اس طبقہ متوسط
کی حمایت کے اصول نکلتے ہیں جو اپنے مال میں سے خدا کا مقرر کیا ہوا حصہ بھی نہیں دیتا۔ یا کسی
ہی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ ہم کو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج اگر حضرت ابوذر غفاریؓ کے فلسفہ کو د
سمجھ جائے تو ساری مشکلات کا خاتمہ ہے۔ لیکن جب مولانا جیسے لوگ ان کی مثال کو سرمایہ داری کی حمای
میں پیش کریں گے تو شاید اس بدقسمت دنیا کی قسمت میں اس یہودی ساحر ہی کے فلسفہ سے تباہ
لکھا ہے جس کے متعلق ابلیس نے کہا ہے۔

نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

(باقی آئندہ)

تفسیر سورہ عصر

نہ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورہ عصر کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ تفسیر
ساتھ بعض دقیق مباحث قرآنی کی حامل ہے۔ لفظ عصر کی تحقیق اور زمانہ کے قسم کی
بصیرت افروز ہے۔ آخر میں ایمان کے مفہوم اور حق و صبر کے باہمی تعلق کی تشریح
یز اور ایمان افروز ہے۔ تقطیع $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$ حجم ۶۶ صفحے۔ کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت
قیمت ۶ر

تفسیر سورہ لہب

امام مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی تفسیر سورہ لہب کا اردو ترجمہ ہے۔ اسمیں
ل تردید کی گئی ہے کہ یہ سورۃ بد دعا ہے۔ ابولہب اور اس کی بیوی کے وجوہ ذکر
ہیں۔ اس تفسیر کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا۔ کتابت
ین، کاغذ نہایت عمدہ۔ حجم ۴۰ صفحے، قیمت ۶ر

تفسیر سورہ کافرون

ں ہجرت اور برأت کا اصلی فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ اور نبوت کے مراحل و مقامات
قدر حکیمانہ انداز میں کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی بیشمار مشکلات آپ سے آپ حل ہو گئی
طباعت بہترین۔ کاغذ عمدہ۔ تقطیع $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$ ضخامت ۴۸ صفحے۔ قیمت ۳ر

مینجر

MUSLIM UNIVERSITY
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
DELHI

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۹۰۳

دائرۂ حمیدیہ کی اعانت

دائرہ حمیدیہ کی خدمت و اعانت، کتاب الٰہی کی خدمت و اعانت ہو۔ اس کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) جو حضرات سو روپے یکمشت دائرہ کو عنایت فرمائیں گے وہ دائرہ کے معاون دائمی متصور ہوں گے۔ ان کو دائرہ کا رسالہ "الاصلاح" اور تمام مطبوعات برابر ہدیۃً دی جائیں گی۔

(۲) جو حضرات پچاس روپے یکمشت عنایت فرمائیں گے۔ ان کو رسالہ "الاصلاح" اور دائرہ کی دوسری مطبوعات برابر نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

(۳) جو حضرات دس روپے سالانہ عنایت فرمائیں گے ان کی خدمت میں "الاصلاح" ہدیۃً جاری کیا جائے گا۔ اور سال بھر کی مطبوعات بلا قیمت بھیجی جائے گی۔

ہدایات و قواعد

۱۔ "الاصلاح" ہر انگریزی مہینہ کی پندرہ تک شائع ہوگا۔

۲۔ اگر مہینہ کی آخر تک پرچہ نہ پہنچے، فوراً دفتر کو لکھ کر منگوا لیجئے ورنہ بقیمت بھیجا جائے گا۔

۳۔ مضامین وغیرہ اڈیٹر کے نام بھیجئے اور دفتر سے متعلق امور کیلئے تمام خط و کتابت منیجر سے کیجئے۔

۴۔ دفتر سے خط و کتابت کرتیں خریداروں کو نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے۔

۵۔ چندہ سالانہ للعہ۔ بیرون ہند کے لئے ۲ ے۔ فی پرچہ ۲ ر

عبدالاحد اصلاحی منیجر دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڈھ

عبدالاحد اصلاحی طابع و ناشر نے اصلاح پریس سرائے میر اعظم گڈھ میں چھاپ کر شائع کیا۔

کتب خانہ [illegible] اسلامیہ

الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

دائرہ حمیدیہ کی اردو مطبوعات

تفسیر سورہ اخلاص

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورہ اخلاص کی تفسیر اردو میں لکھی ہے، اس سورہ کی، ہر دور میں بیشمار تفسیریں لکھی گئیں۔ لیکن اہل نظر نے اعتراف کیا ہے کہ علامہ فراہی کی تفسیر میں جو نکتے بیان ہوئے ہیں، ان سے تمام تفسیریں خالی ہیں۔ کتابت و طباعت بہتر، کاغذ نہایت عمدہ۔ قیمت :- ۵ر

تفسیر سورۂ والتین

استاذ امام علامہ فراہی رحمہ اللہ کی تفسیر سورۂ والتین کا اردو ترجمہ ہے اس میں تین، زیتون، طور سینین اور بلد امین سے وجوہ استشہاد اور ان کی تحقیق کے متعلق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ تحقیق اور وسعت نظر کا اعجاز ہے۔ قیمت ۴ر

تفسیر سورۂ کوثر

استاذ امام مولانا فراہی رحمہ اللہ کی تفسیر سورہ کوثر کا اردو ترجمہ ہے، اس میں کوثر کی تحقیق، خانہ کعبہ کی روحانی حقیقت اور نماز اور قربانی کے اسرار و حقائق پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت و طباعت جاذب نظر عمدہ۔

$\frac{۲۰×۳۰}{۱۶}$ حجم ۱۲۳ صفحہ۔ قیمت ۸ر

نمبر	ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۳۹ء	جلد ۴

فہرست مضامین

شذرات — امین احسن اصلاحی — ۲ - ۷

معارف قرآن

تفسیر سورہ ذاریات — استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ — ۸ - ۱۷

اقسام القرآن — ” ” ” — ۱۸ - ۳۶

مذاکرہ

”ہمارے علماء کے فقہی اختلافات“ — امین احسن اصلاحی — ۳۷ - ۴۸

مقالات

تبلیغ اور پروپگنڈا — جناب مولوی حافظ عبدالاحد صاحب اصلاحی — ۴۹ - ۵۳

حکمت رب

مارکس، ہیس کے خیالات — جناب مولوی نذیر احمد صاحب صدیقی ایم اے — ۵۴ - ۵۶

تقریظ و تبصرہ — ع ۔ ن — ۵۷ - ۶۴

شذرات

دار الاقامہ کی تعمیر نئے دار الاقامہ میں کام برابر جاری ہے۔ چھت پٹ گئی، اب اندر کے حصہ میں پلاستر ہو رہا ہے۔ اور کام جس استقلال اور سرگرمی کے ساتھ ہو رہا ہے اس سے توقع ہوتی ہے کہ انشاء اللہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔

اخلاص کا حال تو اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے مگر فقر ہمیشہ سے اس مدرسہ کی خصوصیات میں رہا ہے۔ اور اسی فقر کے اندر اس کے تمام کام ہوتے رہے ہیں۔ اگر اس کے منتظمین بجٹ بنا کر کام کرنے کے عادی ہوتے تو شاید آج تک ایک جھونپڑا بھی اس میدان میں وہ کھڑا نہ کر سکتے۔ خود اس عمارت کی تعمیر کے لئے ظاہری حالات کے اعتبار سے یہ زمانہ کسی طرح موزوں نہ تھا۔ اولاً تو منتظمین طرح طرح کی مالی مشکلوں میں پہلے سے گرفتار تھے۔ دوسرے نہ ضلع کے مسلمانوں کی مالی حالت اسوقت اچھی تھی نہ باہر کے مسلمانوں سے استعانت کا کوئی موقع تھا۔ اس مدرسہ کی زیادہ تر مدد بمبئی، رنگون، اور ملایا کے پردیسی کرتے ہیں اور ان تمام مقامات کا آج جو حال ہے وہ ہر شخص کو معلوم ہے لیکن ان حالات پر نظر ڈالے بغیر منتظمین نے اس عمارت کی نیو ڈال دی اور پھر کام کو ادھر میں نہیں چھوڑا ہمت کر کے اس کو قریب تکمیل تک پہنچا دیا۔ فَالحَمدُ لِلّٰہ

اس عمارت کی وجہ سے جو جو آزمایشیں پیش آئی ہیں ان سب کو بیان کرنا کچھ ضروری نہیں اگر ان کے کڑوے گھونٹ حلق سے اتر گئے تو یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے اور اگر کچھ اور

گھونٹ باقی ہیں تو جس خدا نے ابتک ہمت کو سہارا اور ارادہ کو استقلال بخشا ہے۔ بس اسی کی نصرت فرمائی غیب پر بھروسہ ہے کہ وہ ہر مشکل کو آسان کرے گا۔

مدرسہ کے اساتذہ و طلبہ اور ملازمین نے اس عمارت کی وجہ سے جو تکلیفیں اٹھائیں اور جو ایثار کیا وہ خود اپنی جگہ پر ایک مستقل داستان ہے۔ مگر اس داستان کی اصلی قدر و قیمت اس میں ہے کہ یہ بیان نہ کی جائے۔ ہاں اگر اس ایثار میں اخلاص ہے تو اللہ تعالیٰ اس اخلاص کا صلہ آخرت میں دے گا اور انشاء اللہ آئندہ نسلیں ان خدمتوں کی قدر کریں گی۔

بہرحال یہ عمارت خدا نے چاہا تو بن کے رہے گی۔ اب اس کی تکمیل کی طرف سے قلب یکسو ہو چکا ہے۔ اسوقت منتظمین کے سامنے سب سے زیادہ اہم سوال اس بار کا ہے جو اس عمارت کی وجہ سے مدرسہ پر ہو گیا ہے۔ جب تک وہ اس بار سے بالکل سبکدوش نہ ہو جائیں اسوقت تک ان کو اس عمارت کی تیاری سے بھی خوشی نہیں ہو سکتی اس سے سبکدوش ہونے کے لئے منتظمین نے جدوجہد شروع کر دی ہے اور انشاء اللہ ان کی تمام کوششوں کی طرح یہ کوشش بھی کامیاب رہے گی۔ الاصلاح اس سعی میں کارکنوں کے ساتھ ہے اور مدرسہ کے جن ہمدردوں تک اس کی آواز پہنچتی ہے ان سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اس کام میں مدرسہ کے کارکنوں کا ہاتھ بٹائیں۔

مدرسۃ الاصلاح کے تمام چھوٹے بڑے کام اب تک صرف قوم کے چھوٹے چھوٹے عطیوں سے انجام پائے ہیں اور ہر مشکل میں اللہ تعالیٰ نے قوم ہی کے ہاتھوں اس کی زندگی اور بقا کا سامان کرایا ہے۔ ہم آج بھی انہی توقعات پر یہ سطریں لکھ رہے ہیں۔ انشاء اللہ رائگاں نہ جائیں گی۔

دائرہ حمیدیہ کے کام الاصلاح کی اشاعت اس سال نہایت غیر منتظم رہی ہے جس کا نہایت افسوس ہے مگر حالات پر کس کو اختیار ہے! الاصلاح پریس ایک دیہات میں ہے۔ اگر پریس کا ایک آدمی بیمار ہوا یا کاغذی نے کاغذ بھیجنے میں کسی وجہ سے تاخیر کی، یا کوئی اور رکاوٹ پیش آئی تو آس پاس سے کسی فوری مدد کا حاصل کرنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مشکل دس مشکلیں پیدا کر دیتی ہے اور ایک آدمی کی بیماری یا غیر حاضری پورے کارخانہ کو معطل۔ ان حالتوں پر رفقا نے بار بار غور کیا لیکن وہ اس کا کوئی حل نہیں پا سکے۔ الاصلاح کے خریدار بالعموم ان باتوں سے ناواقف ہیں اس لئے تاخیر اشاعت سے قدرتی طور پر وہ جھنجلاتے ہیں، شکایتیں لکھتے ہیں اور بعض نصیحت و ملامت پر اتر آتے ہیں لیکن افسوس کہ ان کی ملامتیں اور نصیحتیں ہمارے غم میں اضافہ کے سوا اور کوئی فائدہ ہم کو نہیں پہنچا سکتیں۔ اور ہم خاموش رہتے ہیں کہ جب معاملہ کرتے وقت ہم نے اپنی کوتاہیوں کے لئے خریداروں سے کوئی معافی نامہ نہیں لکھوا لیا ہے تو یقیناً ان میں سے ہر شخص کو نکوہش و ملامت کا حق ہے اور جب تک ہم ان ابتریوں کی اصلاح نہ کر سکیں، تمام افکار کے ساتھ یہ زہر کے گھونٹ بھی پینے پڑیں گے۔

پس وہ تمام کوتاہیاں جو الاصلاح کی اشاعت میں ہو رہی ہیں ان پر اپنی طرف سے ہم انتہائی رنج و افسوس اور خجالت کا اظہار کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود کوئی وعدہ نہیں کر سکتے کہ ان کو دور کرنے کے قابل ہم کب ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم جلد اس قابل ہو جائیں اور ہماری دلی خواہش یہی ہے لیکن سب کچھ اللہ تعالیٰ کی توفیق و کارسازی پر بھروسہ ہے۔ وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ ان اللہ کان علیما حکیما۔

الاصلاح کی اشاعت کے چوتھے سال کے بھی ۶ ۔ ۷ مہینے گذر گئے۔ یہ آزمائشی مدت کی آخری فرصت ہے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس سال بھی کم و بیش چند سو روپئے کا خسارہ بھرنا پڑے گا۔

ایسی حالت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ الاصلاح کا جاری رکھنا قرین مصلحت ہے یا نہیں؛ معلوم نہیں چند مہینوں کے بعد اس مسئلہ کا کیا فیصلہ ہو، مگر میں ہر فیصلہ پر راضی ہوں۔ اس رسالہ کا مقصد قرآن کے فہم و تدبر میں مسلمانوں کو مدد دینا ہے، اگر لوگوں میں اس مقصد عزیز کی قدر ہے اور خدا کی نظر میں اس کی حقیر خدمت لائق قبول ہے تو یہ جاری رہے گا اور میں اور میرے رفقاء بغیر کسی آرزوئے ستائش و تقاضائے صلہ کے اسکے انہماک کو عبادت سمجھیں گے لیکن اگر لوگوں میں اس چیز کی طلب نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کو اس کام کا اس سے زیادہ جاری رہنا مطلوب نہیں ہے تو وہی ہو جو اس کی مرضی ہے ہم اس کی مرضی پر راضی اور شاکر ہیں۔

الاصلاح کے پڑھنے والوں اور اس کے قدر دانوں میں سے جن لوگوں کو الاصلاح کے مستقبل سے ہمدردی ہے وہ اگر پسند کریں تو اس کی توسیع اشاعت میں کوشش کریں۔ ان سب کی مجموعی سعی سے اگر ڈیڑھ سو خریدار مزید پیدا ہو جائیں تو الاصلاح بغیر تردد کے جاری رہ سکتا ہے باقی الاصلاح کی صورت و سیرت میں کوئی ایسی تبدیلی جس کی وجہ سے عوام میں مقبول ہو سکے اب تک سمجھ میں نہیں آئی اور اگر اصل مقصد کو بغیر نقصان پہنچائے کوئی ایسی صورت سامنے آجائے تو ہم کو اس کے قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں لیکن اس مقصد کو چھوڑ کر اگر الاصلاح کو دنیا کی دولت بھی حاصل کرلے تو ہماری نظر میں بجوے نمی ارزد واللہ علیٰ ما نقول شہید۔

کسی اشاعت میں استاذ امامؒ کی عربی تالیف کتاب الاسالیب کی طباعت کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ اس کتاب کے لئے ایک مخلص نے روپیہ دیا ہے۔ اب اور کوئی حالت منتظرہ باقی نہیں رہ گئی تھی لیکن اصلاح پریس (جو ایک چھوٹا پریس ہے) گرمیوں میں کام اچھا نہیں کرتا۔ اور کتاب کا اہتمام

متقاضی تھا کہ یہ زیادہ سے زیادہ صاف ستھری چھپے۔ چنانچہ گرمیوں میں اسکی طباعت ملتوی کردی گئی تھی۔ اور اب برسات میں یہ پریس کے حوالہ کی جارہی ہے۔

اسی کے ساتھ مولانا کی اصول تاویل و مفردات القرآن بھی چھاپ دیجائینگی موخرالذکر قرآن کے ان خاص خاص الفاظ پر مشتمل ہے جن کے باب میں مولانا کی تحقیق عام مفسرین و ارباب تاویل سے الگ ہے۔ اسکی ترتیب میں بعض خامیاں تھیں۔ مولوی اختر احسن صاحب آج کل اس پر محنت کررہے ہیں۔ انشاءاللہ وہ جلد کام ختم کرلیں گے۔ پھر مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کے ملاحظہ کے بعد کتاب کتابت کے لئے دیدیجائیگی۔ چونکہ مولانا کی قرارداد ترتیب کے مطابق مفردات القرآن کتاب الاسالیب اور اصول تاویل ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں اس لئے ان سب کی اشاعت یکجا مناسب معلوم ہوئی۔

"ہندوستانی" حکومت بہار نے ہندی اردو کی نزاع کیلئے ایک راہ مفاہمت تلاش کرنے کی غرض سے جو کمیٹی مقرر کی تھی اس کے کاموں کی بابت محکمہ اطلاعات عامہ حکومت بہار کی طرف سے ہم کو ایک طویل مراسلہ موصول ہوا ہے۔ اسمیں کمیٹی کے کاموں کی بابت جو معلومات درج ہیں اسکے ضروری اقتباسات درج ذیل ہیں۔

کمیٹی کے متفقہ فیصلہ میں ہندوستانی کی تشریح یہ ہے:-

"ہندوستانی زبان وہی ہے جو شمالی ہندوستان کے ہر بازار میں بولی جاتی ہے ہر اسٹیشن پر سمجھی جاتی ہے اور ہر گوشہ میں عام طور پر مروج ہے۔ وہ زبان جو ہندی اردو مصنفین کے زور قلم کا نتیجہ ہے بلکہ وہ بولی جو شمالی ہند کے ہر شہری کے زبان پر چڑھی ہوئی ہے اور جسے وہ غیر ارادی طور پر بولتا اور سمجھتا ہے"۔

اصطلاحات فن کے پیچیدہ مسئلہ کو سلجھانے کے لئے کمیٹی کی پالیسی یہ ہے:-

(۱) "ہندوستانی کیلئے فنی اور علمی مصطلحات مروجہ بول چال سے اخذ کئے جائیں اور جہاں تک ممکن ہو عربی، فارسی اور سنسکرت کے الفاظ سے پرہیز کیا جائے۔

(۲) جہاں یہ ممکن نہ ہو وہاں انگریزی زبان سے مصطلحات قرض لیکر انھیں اپنانے کی کوشش کی جائے۔

(۳) اگر مذکورہ بالا صورتوں میں بھی دشواریاں ہوں تو تیسری صورت یہ ہے کہ تحریروں میں عربی اور سنسکرت کے مصطلحات پہلو بہ پہلو لکھ دیے جائیں۔۔۔۔ آگے چلکر "تنازع للبقا" اور "بقائے اصلح" کے اصول کے ماتحت وقت اس نزاع لفظی کا خود فیصلہ کر دے گا۔"

"کمیٹی نے اس سلسلہ میں ۵ ہزار انگریزی مصطلحات اور ان کے ہم معنی ہندی اور اردو الفاظ کی ایک فہرست مرتب کرکے ملک کے مشہور زبان دانوں کو دعوت دی ہے کہ وہ ان کے مقابل میں خالص ہندوستانی الفاظ مہیا کریں۔ ۔۔۔ اور اعزازی تنخواہ پر چھ زبان دانوں کی خدمات بھی حاصل کرلی ہیں۔

"یہ کام ۱۹۳۹ء کی آخری تاریخوں تک تکمیل کو پہنچ جائے گا۔"

ہندوستانی ڈکشنری کے متعلق کمیٹی کا کارنامہ یہ ہے۔

"ہندوستانی ڈکشنری کی ترتیب کی خدمت ملک کے مشہور ادیب و زبان داں مولوی عبدالحق صاحب کے سپرد کی گئی ہے۔ اور ۳ اسکالروں کو ماہانہ اجرت پر ان کا اسسٹنٹ مقرر کیا گیا ہے۔ ۔۔۔ اس لغت میں سنسکرت کے وہ تمام الفاظ جنھیں اردو مصنفین نے استعمال کیا ہے اور عربی فارسی کے وہ تمام الفاظ جنھیں ہندی کے مصنفین استعمال کرتے آئے ہیں موجود ہوں گے۔ یہ طے پایا ہے کہ مولوی صاحب موصوف ڈکشنری کے مرتب شدہ حصوں کو ڈاکٹر تاراچند کے پاس بھیجتے جائیں اور وہ اس پر اپنے دوسرے رفقائے کار کی مدد سے نظرثانی کرتے جائیں۔ مولوی صاحب نے ڈکشنری کا ایک حصہ مرتب کرکے کمیٹی کے پاس پیش بھی کیا تھا، معلوم ہوا ہے کہ کمیٹی نے انکی ترتیب کی بنیادوں کو بہت پسند کیا ہے۔"

"ہندوستانی گرامر کی تالیف کا کام بھی ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر تاراچند ہی کے سپرد کیا گیا ہے۔"

درسی کتابوں کے متعلق کمیٹی کی پالیسی یہ ہے:۔

"کمیٹی جلد سے جلد اس سلسلہ کی معیاری کتابیں بھی پیش کرے گی۔ مصنفین کو مدعو کیا گیا ہے کہ وہ ہر جگہ یہ

بہتر سے بہتر کتابیں لکھکر کمیٹی کے سامنے پیش کریں۔ منظور شدہ کتابوں کے لئے معقول انعامات کا بھی اعلان کیا گیا ہے۔"

اردو اور ہندی کو تدریجاً ہندوستانی کی طرف لانے کے لئے یہ راہ اختیار کی گئی ہے۔

"ابتداءً چونکہ یہ ناممکن تھا کہ ایک ہی کتاب دونوں رسم الخط کے پڑھنے والوں کے لئے معین کردیجائے اس لئے فیصلہ کیا گیا ہے کہ ابتداءً اردو ریڈروں میں چند صفحات سہل ہندی ادب کے ہوں اور اسی طرح ہندی ریڈروں کا ایک حصہ سہل اردو ادب پر مشتمل ہو اس کے علاوہ ان کتابوں کے چند صفحات خالص ہندوستانی ادب میں بھی ہوں۔ اردو ریڈروں کی ترتیب کا کام جامعہ ملیہ دہلی اور ہندی ریڈروں کی ترتیب بہار ہندی ساہتیہ سمیلن کے سپرد کی گئی۔"

کمیٹی کی یہ کوششیں قابل تعریف اور ملک کے شکریہ کی مستحق ہیں۔ مگر زبان کے معاملہ میں مسلمانوں کی شکایات عموماً کانگریس اور اس کی بنائی ہوئی کمیٹیوں کی تجاویز سے نہیں ہیں کانگریسی ہندوؤں کے طرز عمل سے ہیں اور اس مشکل کا نہ صرف یہ کہ کوئی علاج نہیں ہو سکا بلکہ جو لوگ علاج کر سکتے ہیں وہی اس مرض کو بڑھانے میں سرگرم ہیں۔ ضرورت ہے کہ کانگریس اور کانگریسی گورنمنٹیں ایمانداری کے ساتھ اس مرض کا علاج کریں۔ اور اپنی باتوں کو خود اپنے منہ سے نہ جھٹلائیں۔

خریداروں کو دفتر سے خط و کتابت کرنے میں نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے۔

معارف قرآن

تفسیر سورۂ ذاریات

(۲)

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ

ابر و ہوا سے جزا پر استشہاد کی وجہ

اوپر کی تفصیلات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا۔ میں ہوا کو شہادت میں پیش کیا ہے اور وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ میں سر پر کے ان بادلوں کو جو کڑک اور دمک کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ انذار و تخویف کے لئے کافی ہیں پس اس سے اس غفلت و غرور اور اختلاف و اعتراض کی شناعت ظاہر ہوتی ہے جس میں یہ لوگ سرمست ہیں۔

ٹھیک یہی حال عاد کا تھا

قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ،	بولے یہ بادل ہے جو ہم پر برسنے والا ہے، بلکہ
بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ رِيْحٌ	یہ وہ چیز ہے جس کے لئے تم جلدی مچائے ہوئے تھے،
فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ	ہوا جس کے اندر دردناک عذاب ہے۔

عذاب الٰہی آچکا تھا اور اس کے آثار انھوں نے بادلوں کے تہ بتہ ٹکڑوں میں دیکھ لئے تھے، لیکن اس کے باوجود آنکھیں نہیں کھلیں۔ اس اجمال کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ سمجھنا چاہیے۔

یہ دونوں شہادتیں درحقیقت اللہ تعالیٰ کی نہایت کھلی ہوئی نشانیوں کی شہادتیں ہیں۔ ہواؤں اور بادلوں کے تصرفات عجیب عجیب ہیں کبھی ہوائیں اٹھتی ہیں، بوجھل بادلوں کے مشک اپنی پیٹھوں پر لادتی ہیں۔ اور ان کو چٹیل میدانوں میں لے جا کر تمام دشت وچمن کو سیراب کر دیتی ہیں۔ کبھی سمندروں میں سامان سے بھری ہوئی کشتیوں کو کھیتی ہیں جن سے معیشت اور زندگی کے بے شمار فوائد ظہور میں آتے ہیں۔ کبھی ریگستانوں سے حاصب بنکر ابھرتی ہیں اور آباد بستیوں کو ریگ اور پتھروں سے ڈھک دیتی ہیں کبھی صرصر بنکر اولے اور کڑک کے عذاب کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں۔ کبھی طوفان بنکر سیلاب انگیز بارش لاتی ہیں اور سمندروں میں ہیجان پیدا کر دیتی ہیں۔ ہواؤں اور بادلوں کی یہی مختلف حالتیں ہیں جن کو قرآن نے تقسیم امور سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت اور اس کے تسخیر وتصرف کی ایک عجیب شان ہے کہ وہ ایک قوم کے لئے کبھی ہوا کی تندی اور شدت کو نجات کا ذریعہ بنا دیتا ہے اور کبھی اس کی نرمی اور لینت سے اس کو تباہ کر دیتا ہے۔ اس کی بہترین شہادت فرعون کے قصہ میں موجود ہے جس کی تفصیل آگے آئیگی۔

اسی طرح کبھی ایک ہی چیز رحمت اور نقمت دونوں ہوتی ہے۔ اہل ایمان کے لئے اس میں برکتیں اور عنایتیں ہوتی ہیں اور منکرین کے لئے قہر وغضب۔ اور یہ چیز خدا کی رحمت اور اس کے قہر کو اس طرح تقسیم کرتی ہے جس طرح ایک عاقل فرق وامتیاز کے ساتھ ایک چیز کو تقسیم کرتا ہے۔ اسی سے ملتی جلتی بات زبور ۱۴۷ ۱۵ - ۱۸ میں ہے۔

"وہ اپنا حکم زمین پر بھیجتا ہے
اس کا کلام نہایت تیز رو ہے
وہ برف کو اون کی مانند گراتا ہے
اور پالے کو راکھ کی مانند بکھیرتا ہے
وہ یخ کو لقموں کی مانند پھینکتا ہے

اسکی ٹھنڈ کون سہہ سکتا ہے؛
وہ اپنا کلام نازل کرکے ان کو پگھلا دیتا ہے
وہ ہوا چلاتا ہے اور پانی بہنے لگتا ہے۔

اس عبارت میں دیکھو، ہوا کو کلمۂ رب (حکم خدا) سے تعبیر کیا ہے اور یہ ایک لطیف ترین اسلوب تعبیر ہے کیونکہ عبرانی میں ہوا اور کلام دونوں کے لیے ایک ہی لفظ ہے قرآن مجید کی ایک ہی جامع آیت میں یہ ساری باتیں اکٹھی ہو گئی ہیں۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ	بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور
وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ	دن کی گردش اور ان کشتیوں میں جو سمندر میں
الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ	لوگوں کے نفع کی چیز لیکر چلتی ہیں اور اس
وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ	پانی میں جو خدا نے آسمان سے اتارا پس اس
مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا	سے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا
وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ	اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلائے
الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ	اور ہوا کی گردش میں اور بادلوں میں جو
السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ	آسمان و زمین کے درمیان مسخر عقلمندوں کے لئے
يَعْقِلُونَ	نشانیاں ہیں۔

لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ۔ اس میں نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لئے یعنی اسمیں نشانیاں ہیں توحید، قدرت، ربوبیت، رحمت، اور حکمت اور عدل پر۔

الغرض ہواؤں اور بادلوں کی ایسی گردش جس میں عام خلق الٰہی کے لئے بہبود اور خاص خاص جماعتوں کے لئے ضرر ہو اس امر کا ثبوت ہے کہ کارخانۂ خلق بالکل بے مقصد اور بے نظام

نہیں چل رہا ہے۔ یہ ہوائیں برے اور بھلے کے درمیان امتیاز کرتی ہیں، ایک قوم کے لئے عذاب بنکر نمودار ہوتی ہیں، دوسری کے لئے رحمت بنکر۔ پس یقیناً یہ سارا کارخانہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت کے مطابق چل رہا ہے۔

نیز اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے احاطہ اور قابو میں ہے یہاں تک کہ ہوا جو ایک بے سمجھ بوجھ کی مخلوق ہے وہ بھی خدا کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کرتی اور اس کی حرکت ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے عدل و حکمت کے ظہور کی بشارت ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	اور اللہ کیلئے ہے آسمانوں اور زمین کی فوجیں

ہواؤں کے یہ عجائب تصرفات اس امر پر بھی دلیل ہیں کہ غلبہ و نصرت ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی جماعت کے لئے ہے۔ یہ ہوائیں بشارت اور انذار کے ساتھ نمودار ہوتی ہیں۔ اس کی وضاحت سورہ والصّٰفّٰت میں ملتی ہے، جس کے شروع میں خدا نے اپنی افواج کی قسم کھائی ہے اور پھر فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا	اور ہمارا حکم پہلے ہو چکا ہے اپنے فرستادہ بندوں
الْمُرْسَلِيْنَ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ	کے لئے کہ وہی فتحمند ہوں گے اور ہماری ہی
وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ	فوج غالب ہونیوالی ہوگی۔

پھر یہ سب ملکر جزا کی نہایت واضح دلیل ہیں۔ یہاں ان اجمالی اشارات پر بس کرتے ہیں۔ آگے چلکر جب ہم ان قوموں کے حالات بیان کریں گے جو ہواؤں کے تصرفات سے تباہ ہوئی ہیں تو وہاں ان ہواؤں اور بادلوں کی گوناگوں نیرنگیاں تمہارے سامنے آئیں گی۔

(۴) ان آیات کا تعلق باہمدگر اور مابعد سے

ہواؤں کی شہادت، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، رحمت اور عذاب دونوں کی جامع ہے۔ سورۂ مرسلٰت کی تفسیر میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ قرآن نے اس کے نفع کے پہلو کو اکثر مقامات میں بیان فرمایا ہے اور کہیں کہیں اس کے عذاب کے پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس کی باگ ایک صاحب حکمت و قدرت کردگار کے ہاتھ میں ہے۔ پس معاملہ کی اس حقیقت کے لحاظ سے مناسب ہوا کہ اس شہادت کے بعد ایسا قول آئے، جو رحمت و عذاب دونوں کو عام ہو۔ چنانچہ فرمایا۔ انما توعدون لصادق، وان الدین لواقع (جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے سچ ہے اور جزا واقع ہو کے رہے گی) اور والسماء ذات الحبک (دھاریوں والے آسمان) کی شہادت میں انذار کا پہلو غالب تھا۔ بلکہ موسم سرما کے سرخ سرخ اور تہ بہ تہ بادلوں کی صورت ہی سرتاسر زجر و وعید ہے۔ اس لئے مناسب ہوا کہ اس کے بعد مذاق اڑانے والوں اور عذاب کیلئے جلدی مچانے والوں کا ذکر آئے۔ پھر چونکہ یہ وعدہ اور جزا کے ایک ہی پہلو کا بیان تھا۔ اس لئے مناسب ہوا کہ اس کے بعد اس کا دوسرا پہلو بھی بیان ہو۔ یعنی منکرین کے انجام کے ساتھ ساتھ اہل ایمان کے صبر و تقویٰ کا ثمرہ بھی بیان کر دیا جائے۔ یہ بات قرآن مجید کے عام اسلوب کے لحاظ سے بھی ضروری تھی۔ قرآن مجید میں ترہیب کے ساتھ ترغیب، اور ایک شے کے ساتھ اس کے مقابل کا بیان بالعموم ہوتا ہے۔ پس چونکہ یہاں نافرمانوں کا اور ان کی بعض خصوصیات کا ذکر ہوا تھا اس لئے ان کی مقابل جماعت اور اس جماعت کی بعض نمایاں خصوصیات کا بھی بیان ہوا۔ اور کنایۃً گویا یہ بات واضح کر دی گئی کہ یہ منکرین نیکوکاروں کی خصوصیات سے بمراحل دور ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

إِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ (۱۵) اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ اِنَّهُمْ

كَانُوا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِينَ (١٦) كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ (١٧)
وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ (١٨) وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (١٩)

پرہیزگار باغوں اور چشموں میں ہوں گے ۔ لیتے ہوں گے جو بخشا ہے ان کو ان کے پروردگار نے ۔ بے شک وہ اس سے پہلے نیکوکاروں میں تھے ۔ راتوں کو کم سوتے تھے ، صبح کے وقتوں میں مغفرت مانگتے تھے اور ان کے مالوں میں سائل اور بے زبان محتاج کا حق تھا ۔

الفاظ کی تحقیق اور جملونکی تاویل

(از آیت ۱۵ — ۱۹)

المتقین ایک جامع اور امتیاز قائم کرنے والی صفت ہے ۔ جیسا کہ سورہ بقرہ کی تفسیر میں اس کی تفصیل گذر چکی ہے یہاں موقع و محل کے اشارہ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اوپر کی آیات میں منکرین کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں ، یہ جماعت اس کی ضد صفات سے متصف ہے ۔

فی جنت وعیون مسرت و کامیابی کی تعبیر ہے ۔ یعنی ہمیشہ نعمت و فراغت میں رہیں گے ۔

اخذین حال واقع ہے اور اس کے حال ہونے میں ایک خاص خوبی ہے ۔ یہ اس امر پر دلیل ہے کہ یہ نعمت ان کے لئے ہمیشہ باقی رہے گی ۔ اگر "اخذوا ما اتاھم" ہوتا تو یہ خوبی نہ پیدا ہوتی ۔ سابق جملہ میں دوام نعمت کا مضمون نہایت واضح طور پر ہے پس اس کے حال ہونے کی صورت میں کھلا ہوا مطلب یہ ہوگا کہ وہ 'برابر باغوں چشموں ، اور اپنے پروردگار کی بخششوں میں رہیں گے' ۔

انھم کانوا یہ وصف ہے لیکن موقع میں دلیل کے ہے ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ منکرین کے صفات اس کے بالکل خلاف ہیں ۔ قرآن مجید میں اس اسلوب کی مثالیں بہت ہیں ۔ اس جملہ میں التفات کی شان ہے اور "ذوقوا فتنتکم" کے مشابہ ہے ۔ گویا قیامت کا دن

آچکا ہے۔ اور دنیا میں یہ لوگ جن صفات و فضائل سے متصف تھے ان کا بیان ہو رہا ہے۔
محسنین | عام ہے لیکن نماز اور زکوٰۃ چونکہ زیادہ اہم اور مقدم ہیں، اور ان دونوں کو اہل ایمان کی ایک ممیز خصوصیت قرار دیا گیا ہے اس لئے ان میں اس کا پہلو زیادہ نمایاں ہوگا۔ چنانچہ بعد کی آیتوں میں ان لوگوں کی شب بیداری اور فیاضی کا ذکر بھی ہے۔

کانوا قلیلا من اللیل ما یھجعون   ہجوع کے معنی سونے کے ہیں۔ یعنی وہ شب میں ذکر الٰہی اور نماز میں مشغول رہتے تھے۔ بستر راحت پر آرام نہیں کرتے تھے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے۔

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ	ان کے پہلو بستروں سے دور رہتے ہیں، وہ اپنے
يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا	پروردگار کو یاد کرتے ہیں، خوف اور طمع سے اور جو کچھ
وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ	ہم نے انھیں روزی دی ہے اسمیں سے خرچ کرتے ہیں۔

سورہ مزمل میں فرمایا ہے۔

يٰاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا	اے کپڑوں میں لپٹنے والے رات کو کھڑا ہو مگر تھوڑا حصہ۔

یہ جملہ ان کے محسن ہونے کا بیان ہے۔ اس کی تالیف کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں لیکن مطلب ہر صورت میں ایک ہی ہوگا۔ ایک شکل یہ ہے کہ انھم کانوا قلیلا ھجوعھم (ان کا شب میں سونا تھوڑا تھا) دوسری شکل یہ ہے کہ کانوا قلیلا ما یھجعون فیہ من اللیل۔ (شب میں ان کے سونے کا حصہ تھوڑا تھا) ایک تیسری شکل یہ ہے کہ وکانوا یھجعون قلیلا من اللیل۔ (رات کو وہ تھوڑا سوتے تھے۔) باقی وہ پہلو جس کا امام رازیؒ نے ذکر فرمایا ہے یعنی انھم کانوا قلیلین وانھم لا یھجعون من اللیل (وہ تھوڑے تھے اور شب میں سوتے نہیں تھے) ہمارے نزدیک حقیقت سے بہت دور اور نا قابل توجہ ہے۔

وبالاسحار اسفار سے کچھ پہلے کا وقت سحر کا وقت ہے اور یہی وقت استغفار کے لئے سب سے زیادہ مناسب ہے۔ ایک جگہ متقین کی تعریف میں فرمایا ہے الصّٰبرین والصدقین و القٰنتین والمنفقین والمستغفرین بالاسحار۔ صحیح احادیث میں بھی اس کی تصریح موجود ہے۔ ہم نے تفسیر سورۂ آل عمران میں اس کا سبب بتایا ہے۔ حضرت حسن نے "وبالاسحا" کے "واؤ" سے ایک اور نکتہ پیدا کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ "و" "متقین کی دونوں صفتوں کے اتصال کی دلیل ہے گویا وہ نماز میں ایسا مستغرق اور منہمک ہوتے ہیں کہ سحر کے استغفار کا وقت آجاتا ہے"۔ آیت کے لفظوں کا ظاہر مطلب تو یہ نہیں ہے لیکن نکتہ لطیف ہے۔

المحروم 'سائل' کے بعد اس لفظ کا آنا اس کے معنی پر روشنی ڈالتا ہے۔ یعنی وہ شخص جو غربت کے باوجود لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ قتادہؒ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "وہ مسکین جو لوگوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے"۔ زہری فرماتے ہیں کہ "محروم کے معنی متعفف کے ہیں"۔ ان حضرات کی نظر غالباً اس آیت پر ہے۔

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ
ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ
اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ
بِسِيْمَاهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ
اِلْحَافًا (بقرہ ۲)

ان محتاجوں کیلئے جو خدا کی راہ میں گھر گئے ہیں
زمین میں (تلاش معاش کیلئے) نقل و حرکت نہیں
کر سکتے، جاہل ان کو ان کی خودداری کے باعث
غنی سمجھتا ہے مگر تم ان کو ان کی پیشانی سے پہچان
لے سکتے ہو۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر
نہیں مانگتے۔

(۶) ان آیتوں کا نظم، ان کی دلالت اور ماقبل و مابعد سے تعلق

مقابلہ کے اصول پر کافروں کے ذکر کے بعد اہل ایمان کا بھی ذکر فرمایا۔ اور بلاغت ایجاز سے کلام کے وہ بہت سے پہلو واضح کردئے ہیں جو مذکور نہیں ہیں۔ منکرین کی بابت فرمایا ہے کہ وہ غفلت کی مدہوشی میں ہیں۔ اس سے یہ بات خود بخود نکل آئی کہ اہل ایمان کے سامنے روز جزا کے متعلق یقین و بصیرت کی پوری روشنی ہے اور وہ اس دن کے انتظار میں برابر جاگ رہے ہیں اور یہ سارا مضمون صرف ایک لفظ "متقین" سے سامنے آگیا کیونکہ تقویٰ بصیرت کی اصل ہے۔ اس پر پوری بحث اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ اسی طرح متقین کے لیے جو صفتیں بیان کی ہیں، ان میں احسان، نماز، اور زکوٰۃ کا ذکر فرمایا جس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہوگئی کہ منکرین بخیل اور سخت دل ہیں۔ جیسا کہ ایک مقام میں تصریح کے ساتھ موجود ہے۔ قالوا لم نك من المصلين ولم نك نطعم المسكين۔ کہیں گے نہ ہم نماز پڑھنے والوں میں تھے اور نہ مسکین کو کھلاتے تھے۔

یہ آیتیں جو "انکم لفی قول مختلف" کے بعد سے شروع ہوتی ہیں اور "وحق للسائل والمحروم" پر ختم ہوتی ہیں۔ بطور جملہ معترضہ جزا کی دلیلیں بیان ہونے کے بعد آگئی ہیں۔ پہلے منکرین کو جھڑکی دی ہے اور اس کے بعد ان کی مقابل جماعت کا ذکر کرکے ترہیب و ترغیب کے دونوں پہلو جمع کردئے ہیں۔ پھر اس سے فارغ ہوکر اصل عمود کی بات (یعنی جزا کا اثبات) شروع ہوگئی ہے اور یہاں جملہ کا جوڑ "واؤ" سے ملایا تاکہ واضح ہو جائے کہ اوپر جو قسمیں گزری ہیں ان میں جزا کے دلائل و شواہد موجود ہیں۔ فرمایا

وفی الارض ایت للموقنین (۲۰) وفی انفسکم افلا تبصرون (۲۱) وفی السماء رزقکم
وما توعدون (۲۲) فورب السماء والارض انه لحق مثل ما انکم تنطقون (۲۳)

(باقی)

اقسام القرآن

(۳)

قسم کیلئے مقسم بہ ضروری چیز نہیں

مشہور الفاظ قسم کی تشریح

۷۔ اللہ اور اس کے شعائر کی قسم مفرد اور بسیط معانی و مفاہیم میں سے نہیں ہے کہ اس کیلئے شروع ہی سے مستقل الفاظ وضع ہو کر استعمال میں آتے۔ یہ چیز تو معاشرتی ضروریات اور دینی عقائد کے تالیف و امتزاج سے پیدا ہوئی ہے۔ پس یہ بات صحیح نہیں ہے کہ جہاں کہیں مقسم بہ مذکور نہ ہو وہاں ہم یہ خیال کرلیں کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی قسم ہے اور وہ مقدر ہے۔ تعظیمی اقسام پر ہم دسویں فصل میں بحث کریں گے وہاں ان کی اصلی نوعیت پوری طرح واضح ہو جائے گی

اس فصل میں ہم ان الفاظ کے معانی کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں جو قسم کے لئے عام طور پر مستعمل ہیں اور مقصود یہ دکھانا ہے کہ یہ الفاظ اصلاً اللہ تعالیٰ یا اس کے شعائر یا کسی خاص چیز کی قسم کے لئے نہیں وضع ہوئے تھے۔ وہ الفاظ یہ ہیں۔

یمین، نذر، الیّہ، قسم، حلف۔

"یمین" کی اصل حقیقت، اور قسم کے لئے اس کا عام استعمال، اوپر تفصیل سے ہم بیان کر چکے ہیں اور اس میں رہن، کفالت اور ضمانت کا جو مفہوم ہے اس کی طرف بھی اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

"نذر" کے اصل معنی کسی شے کو دور کرنے اور اس سے بچنے کے ہیں۔ اگر کسی شے کو تم اپنے سے ہٹا کر خدا کے لئے خاص کر دو تو یہ "نذر" ہوئی۔ یہیں سے اس میں کسی شے کو حرام کر دینے کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ عبرانی میں بھی اس کا یہی مفہوم ہے۔ پھر اپنے اوپر کسی لذت کو حرام کر دینے کے لئے استعمال ہونے لگا۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ، اپنے اوپر کسی شے کو بطور قسم لازم کرنے کے مفہوم کے لئے اس میں وسعت پیدا ہو گئی۔

"الیۃ" کے معنی ہیں کسی امر سے کوتاہی کرنا۔ "آلی" اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی شے سے کوتاہ اور عاجز ہو۔ پھر یہ کسی شے کو چھوڑ دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ یہیں سے یہ عورتوں سے بطور قسم ترک تعلق کے معنی میں منتقل ہو گیا۔ پھر اس میں مزید وسعت پیدا ہوئی اور کسی شے کے لازم کر لینے کے لئے استعمال ہونے لگا۔ خواہ یہ لازم کر لینا بصورت ترک ہو، یا بصورت اختیار۔ لیکن اس میں غالب پہلو کسی ایسی شے کے لازم کرنے کا ہے جس میں کچھ مضرت کا شائبہ ہو۔ اس اعتبار سے یہ "نذر" سے مشابہ ہے۔ ابن زیابۃ کا شعر ہے۔

آلیت لا ادفن قتلاکم   فدخنوا المرء وسرباله

میں نے قسم کھائی ہے تمہارے مقتولوں کو دفن نہ کروں گا پس آدمی کو اور اس کے کپڑوں کو دھونی دو۔

پھر آہستہ آہستہ اس میں مزید وسعت پیدا ہوئی اور یہ قسم کے مرادف بن گیا، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔

"قسم" قسم کے اصل معنی (قطع) کاٹنے کے ہیں۔ قسمت الشئ وقسمتہ اسی معنی میں مستعمل ہیں۔ اور قطع کا لفظ شک وشبہ کی نفی کے لئے عام ہے۔ عربی زبان میں اس کے شواہد بہت ہیں۔ صریمۃ، جزم، قول فصل، ابانۃ، صدع، قطع وغیرہ الفاظ سب میں یہ حقیقت موجود ہے۔ ایک ہی روح ان تمام الفاظ کے اندر ساری ہے۔ پھر قولاً کسی بات کو قطعی طور پر واضح کر دینے کے لئے لفظ "قسم" ان میں سے مخصوص ہو گیا اور اس کا استعمال باب افعال سے ہوا کیونکہ باب افعال

میں مبالغہ کی خاصیت ہو۔ مثلاً اسفر الصبح ۔ اور اس کیلیے مقسم بہ کوئی ضروری شرط نہیں۔ خواہ مقصود بیان خبر ہو، یا اظہار عزیمت۔ طرفہ نے اپنے معلقہ میں کہا ہے اقسم ربها لتکتنفن (اس کے مالک نے قسم کھائی کہ اسکی بنا کی جائے) کلام عرب میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔

جنوب اپنے مشہور مرثیہ میں کہتی ہے۔

فاقسمت یا عمرو لو نبهاك   اذاً نبها منك امراً عضالا

پس میں نے قسم کھائی اے عمرو کہ اگر وہ (چیتے) اسوقت تجھکو جگا دیتے تو تیرا جگنا ان کیلیے غضب ہو جاتا۔

ریطہ سلمیہ کا شعر ہے۔

فاقسمت لا انفك احدث عبرة   تجود بها العينان منى لتسجما

پس میں نے قسم کھائی کہ برابر میری دونوں آنکھیں آنسو بہاتی رہیں گی۔

خرنق اخت طرفہ کہتی ہے۔

آلا اقسمت اسی بعد بشر   علی حی یموت ولا صدیق

میں نے قسم کھائی ہے کہ بشر کے بعد کسی مرنے والے اور کسی دوست پر غم نہ مناؤں گی۔

قرآن مجید میں ہے۔

اَهٰؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ	کیا یہی لوگ ہیں جن کے بارہ میں تم نے قسمیں کھائی تھیں کہ خدا کی رحمت میں ان کیلیے کوئی حصہ نہیں ہے

دوسری جگہ ہے۔

وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَکُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ	اور اس نے (ابلیس نے) ان دونوں سے قسمیں کھائیں کہ میں تم لوگوں کے خیرخواہوں میں ہوں

۵۔ مگر تم کہو کہ ان مقامات میں مقسم بہ، اللہ تعالیٰ ہے جو مقدس ہے تو ہم کو احتمال کی حد تک اس سے

انکار نہیں ہے۔ ہم اس کے احتمال کو تسلیم کرتے ہیں، البتہ اگر تم اس کے لازم ہونے کا دعویٰ کرو تو ہم اس کے منکر ہیں۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ایسے مواقع میں مقسم بہ کوئی لازمی چیز نہیں۔ اس دعویٰ کے ثابت کرنے کیلئے اوپر جو دلائل بیان ہوئے وہ کافی ہیں تم دیکھ چکے کہ قسم کبھی اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے اور کبھی اس کے علاوہ کسی اور چیز کی اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سرے سے مقسم بہ ہوتا ہی نہیں۔ ایسے مواقع میں محض تاکید اور جزم کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔

'حلف' کے معنی بھی کاٹنے اور تیز ہونے کے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ بالکل لفظ قسم کے مشابہ ہے۔ عربی میں 'سنان حلیف' اور 'لسان حلیف' وغیرہ محاورات عام طور پر مستعمل ہیں۔ ازہری کے نزدیک یہ 'حلفہ' سے ماخوذ ہے، جو ایک تیز نکیلی نبات ہے۔ پس 'حلف علی امر' کا مفہوم بعینہ وہی ہوگا جو 'قطع بامر' کا ہوگا۔ لفظ کی اصل معنوی روح یہی ہے۔ پھر یہ لفظ قسم کی طرح قول میں عزیمت اور پختگی کے اظہار کے لئے استعمال ہونے لگا۔ اور اسی وجہ سے اس کے لئے مقسم بہ کوئی ضروری شرط نہیں۔ اوپر جو واقعات بیان ہوئے ہیں ان میں تم دیکھ چکے ہو کہ باہم دگر جس طرح بھی معاہدۂ موالات و دوستی ہوگیا، فریقین آپس میں حلیف بن گئے۔ اور ایک دوسرے کو حلیف کہنے لگے۔ ہم ان میں کہیں یہ بات نہیں پاتے کہ فریقین نے کسی متعین چیز کی قسم کھائی ہو۔

اس فصل میں اور اس سے پہلے کی فصلوں میں جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں اس سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی کہ قسم کے لئے سرے سے مقسم بہ کوئی ضروری شرط نہیں ہے۔ اس کی تعظیم و احترام کا پہلو تو الگ رہا۔ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں ہم نے اب تک جن الفاظ قسم سے بحث کی ہے وہ ایسے الفاظ ہیں جو قسم کے لئے عام طور پر مستعمل ہیں۔ اور ان کے اصلی معنی اس مستعمل مفہوم کے مقابل میں بالکل غائب ہوگئے ہیں۔ اس لئے ہم نے ان سے پہلے بحث کی، لیکن ان کے علاوہ بھی بہت سے الفاظ ہیں جن میں ان کے اصلی معانی کی

رعایت باقی ہے ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت پوری طرح آئینہ ہوجائے گی کہ ان میں مقسم بہ کی تعظیم کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی موجود نہیں ہے۔ آگے کی فصل میں، ہم ان الفاظ پر بحث کرتے ہیں۔

قسم کا اصلی مفہوم جبکہ مقسم بہ موجود ہو

۸۔ جو قسم مقسم بہ سے خالی ہو اس کی اصل حقیقت جب تم پر واضح ہوگئی تو مقسم بہ والی قسموں کا سمجھنا تمھارے لئے کچھ مشکل نہیں رہا۔ ان کی حقیقت بس یہ ہے کہ قسم کھانے والا اپنے ساتھ اپنے دعویٰ کے گواہ کے طور پر مقسم بہ کو ملا لیتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان قسموں میں بیشتر و ، ب ، ت وغیرہ کا استعمال ہے۔ جو معیت وصحبت کا مفہوم ظاہر کرنے والے حروف ہیں۔ "و" اور "ب" معیت وصحبت کے مفہوم کے لئے مشہور و متداول ہیں البتہ "ت" کے باب میں تمھیں تردد ہوگا لیکن یہ بھی حقیقت میں "و" ہے جو منقلب ہوکر "ت" بن گئی ہے جس کی مثال تم "تقویٰ" اور "تجاہ" وغیرہ الفاظ میں دیکھتے ہو۔

اوپر ہم نے قسم کی جو تاریخ بیان کی ہے اس سے بھی ہماری اس تاویل کی تائید ہوتی ہے اس میں تم دیکھ چکے ہو کہ قسمیں ہمیشہ علی رؤس الاشہاد ہوتی تھیں اور تمام فریق اپنی قسموں کو موکد کرنے کے لئے موقع پر موجود ہوتے تھے۔ اور اصل مقصد کے اعتبار سے صحیح طرز عمل بھی یہی تھا کیونکہ آدمی اپنے تئیں سب کی نظروں کے سامنے جھوٹا ثابت کرنے سے اجتناب کرتا ہے۔ قرآن مجید سے بھی ہمارے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے۔ انبیاء کے میثاق سے متعلق فرمایا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ	اور جبکہ اللہ نے درباره انبیاء میثاق لیا کہ میں نے جو تم کو
لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ	کتاب وحکمت دی، سو جب آئے تمھارے پاس کوئی
ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ	رسول مطابق اس کے جو تمھارے پاس ہے تو تم اس

لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ	ایمان لاؤ اور اس کی مدد کیجو۔ پوچھا کیا
قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی	تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا ذمہ لیا۔ کہا ہم نے
ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا	اقرار کیا۔ کہا اس گواہ رہو اور میں بھی تمھارے
قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ	ساتھ گواہوں میں ہوں پس جو پھرے
مِنَ الشّٰهِدِیْنَ فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ	اس کے بعد تو وہی لوگ بد عہد ہیں۔
ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ	. . . .

یعنی یہ عہد جو تم سے میں نے باندھا ہے اپنی اور تمھاری موجودگی میں باندھا ہے پس اس سے مکرنا کسی حال میں جائز نہیں اور جو اس عہد کو توڑیں گے وہ بد عہد او خائن ہوں گے۔

اس طرح کی تاکیدات کا اصلی راز یہ ہے کہ آدمی جب کہتا ہے کہ " اشہد بہ " میں اسکی شہادت دیتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں اس کو اپنے علم، واقفیت اور مشاہدہ کی بنا پر کہتا ہوں، صرف دوسروں سے سن کر نہیں کہتا۔ پس ایسی شہادت کے بعد بھی اگر وہ جھوٹ بولے اور مکر جائے تو اس کے لئے کوئی وجہ عذر نہیں ہے۔ اسی بنا پر حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا

وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَ	اور ہم نے نہیں شہادت دی مگر اس بات کی جو
مَا كُنَّا لِلْغَیْبِ حٰفِظِیْنَ	ہم نے جانی اور ہم غیب کے علم نہیں

قسم میں اس پہلو کا استعمال بہترین شکل میں اس آیت میں پایا جاتا ہے۔

لٰكِنِ اللّٰهُ یَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ	لیکن اللہ گواہی دیتا ہے اس چیز کی جو تم پر
اِلَیْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ	اتارا، اس کو اتارا اپنے علم سے اور
یَشْهَدُوْنَ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا	ملائکہ گواہ ہیں اور اللہ کی گواہی کافی ہے۔

اس کے علاوہ شہادت میں تاکید و توثیق کے اور دوسرے نہایت اہم وجوہ بھی موجود ہیں۔ ازانجملہ ایک یہ ہے کہ آدمی جب یہ کہتا ہے کہ "میں شہادت دیتا ہوں کہ فلاں بات یوں ہے" تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اس معاملہ میں اپنا بیان اس ذمہ داری کے ساتھ دے رہا ہے جس ذمہ داری کے ساتھ ایک گواہ کسی معاملہ میں گواہی دیتا ہے۔ گواہی کی ذمہ داریاں ہر شخص کو معلوم ہیں کہ گواہی میں جھوٹ بولنا کس قدر قابل مذمت اور گناہ کی بات ہے۔ تمام شرائع میں صراحت کے ساتھ اس کی ممانعت آئی ہے۔ تورات کے احکام عشرہ میں بھی اس کا ذکر ہے۔ قرآن نے نیکوکاروں کی جو صفات گنائی ہیں ان میں ایک صفت ان کی یہ بھی بتائی گئی ہے کہ "والذین لایشھدون الزور" جس کی ظاہر تاویل یہی ہو سکتی ہے کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔

علاوہ ازیں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ "انا اشھد" "واللہ یشھد" اور "واللہ یعلم" وغیرہ الفاظ عام طور پر عربی زبان میں قسم کے لئے مستعمل ہیں اور یہ بات کچھ عربی زبان کے ساتھ ہی مخصوص نہیں، مشرق و مغرب کی دوسری قوموں میں بھی عادات و اطوار کے ہزار اختلافات ہوں لیکن جب وہ بولیں کہ "اللہ اس بات پر گواہ ہے" یا اس کے مشابہ اور ہم معنی کوئی فقرہ ہو تو ان کے ہاں بھی اس کا مطلب قسم کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ سیبویہ نے لام قسم کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ "افعال میں سے بعض ایسے ہیں جن میں قسم کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اور ان کے بعد اگر کوئی فعل آئے تو اس کی نوعیت ٹھیک وہی ہوتی ہے جیسی کہ اقسم لافعلن اور اشھد لافعلن میں ہے۔" اس سے اتنی بات بالکل غیر مشتبہ طور پر ثابت ہوتی ہے کہ سیبویہ کے نزدیک 'اشھد' کے معنی قسم کے ہیں اور 'اقسم' اور 'اشھد' بالکل یکساں ہیں۔

اور اس سارے جھگڑے کو قرآن مجید کی ایک آیت چکا دیتی ہے جس میں "شہادت" اور "اشہاد" تصریح کے ساتھ قسم کے معنی میں ہے۔ فرمایا ہے۔

إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا	جب تمھارے پاس منافق آتے ہیں کہتے ہیں ہم گواہی
نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ وَ	دیتے ہیں کہ تم اللہ کے رسول ہو اللہ جانتا ہے کہ
اللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللّٰهُ	تو اسکا رسول ہے اور اللہ گواہ ہے کہ منافق
يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ	جھوٹے ہیں انھوں اپنی قسموں کو ڈھال
اِتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا	بنا لیا ہے پس اللہ کی راہ سے رک گئے
عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ	ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انکی شہادت کو انکی قسم (اتخذوا ایمانہم) قرار دیا ہے۔

اسی طرح ایک دوسری آیت میں بھی تصریح ہے کہ "اللہ کی شہادت" قسم ہے۔

وَيَدْرَءُا عَنْهَا الْعَذَابَ أَنْ	اور اس سے سزا کو یہ بات دفع کر دیگی
تَشْهَدَ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ	کہ وہ چار قسمیں اللہ کی کھائے کہ وہ جھوٹا
إِنَّهُ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ	ہے۔

ایک اور مقام میں ہے

وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِي قَلْبِهِ وَ	اور وہ اللہ کی قسم کھاتا ہے اپنے دل کی بات پر
هُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ	اور وہ شدید ترین دشمن ہے۔

اس ساری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی شی کی قسم کا مطلب دراصل اس شی کی شہادت پیش کرنا ہے۔ یہاں بقدر ضرورت دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ مزید تفصیل دسویں فصل میں ملے گی۔

رہا قسم بہ کی تعظیم کا مفہوم تو یہ قسم کے لازمی شرائط میں سے نہیں ہے اس کے عوارض میں سے ہے۔ خاص خاص صورتوں میں یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ آگے اس پر ہم بحث کریں گے۔

قسم کی حقیقت اور اس کا اصلی مفہوم بیان کر چکنے کے بعد اب ہم قسم کے ان مفاہیم کو

کو بیان کرنا چاہتے ہیں جو اس اصلی مفہوم کی فروع کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی اکرام، تقدیس اور استدلال۔ اور ان کو ترتیب کے ساتھ پیش کریں گے تاکہ اس کے تمام وجوہ اچھی طرح تمہاری سمجھ میں آجائیں اور ان کی رہبری میں تم قرآن کی قسموں پر غور کرکے جو رائے قایم کرو وہ علی وجہ البصیرۃ ہو۔

(باقی)

امعان فی اقسام القرآن

(عربی)

اس کتاب میں اس شبہہ کا نہایت تسلی بخش جواب دیا گیا ہے کہ خدا نے قرآنمجید میں قسمیں کیوں کھائیں؟ اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآنمجید کی قسمیں استدلال و شہادت کیلئے ہیں۔ اس کتاب کے متعلق علامہ سید سلیمان صاحب ندوی نے اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:۔

"علی گڈھ کے قیام ہی کے زمانہ میں انھوں (مولانا) نے اقسام القرآن لکھی۔ یعنی اس مشکل کا حل فرمایا کہ خدا نے قرآنمجید میں قسمیں کیوں کھائیں؟ اس سوال کے جواب میں سب سے پہلے امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں جستہ جستہ فقرے لکھے تھے۔ پھر ابن قیمؒ نے التبیان فی اقسام القرآن لکھی۔ مگر مولانا حمید الدین صاحب کی تحقیقات نے اپنی الگ شاہراہ نکالی اور حقیقت یہ ہے کہ اس بارہ میں انھوں نے ایسی داد تحقیق دی کہ تیرہ سو برس میں اسلام میں کسی نے نہیں دی۔ مولانا شبلی مرحوم نے ان کے اس رسالہ کا خلاصہ نہایت مسرت و خوشی کیساتھ الندوہ اپریل ۱۹۱۰ء میں شائع کیا اور عربی رسالہ اقسام القرآن کے نام سے الگ شائع ہوا۔ اس کے بعد اس رسالہ کو مزید تحقیقات سے موید کرکے امعان فی اقسام القرآن کے نام سے علی گڈھ میں چھپوایا۔ اسوقت سے لیکر آج تک مختلف مدعیان تحقیق نے اقسام القرآن پر جو کچھ کہا ہے وہ تمامتر مولاناؒ کے خوان علم کی زلہ ربا ہے۔" اب یہ کتاب مولاناؒ کے مزید اضافہ و نظر ثانی کے بعد مصر کے نہایت خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے۔ قیمت ۸

"منیجر"

مذاکرہ

"ہمارے علماء کے فقہی اختلافات"

الاصلاح چونکہ جمعیۃ علماء کا حامی ہے، اس جرم میں اس کو بہت سے طعنے سننے پڑتے ہیں۔ ابھی ابھی ایک عزیز دوست کا ایک گرامی نامہ موصول ہوا ہے جس میں موصوف نے الاصلاح کے اڈیٹر کو توجہ دلائی ہے کہ "جس زمین پر وہ "سرپٹ" دوڑ رہا ہے وہ یکسر دلدل ہے۔ علماء کی جمعیۃ ایک بے معنی لفظ ہے۔ علماء میں بے شمار مذہب ہیں اور ہر مذہب ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے، ہر امت کی ایک مستقل کتاب اور ان کے مستقل ائمہ ہیں، ان پراگندہ اور مختلف مذاہب کی پیرو امتوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی آرزو خواب و خیال ہے زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک مسلک و مذہب کے پیرو یکجا ہو جائیں گے، گو توقع اس کی بھی نہیں، باقی سب ہمیشہ بدگمان اور الگ رہیں گے۔ پھر اس سعی لاحاصل میں کیوں وقت برباد کیجیے،

.... راہ وہی ہے جس کی طرف ہم بلاتے ہیں .... پس اس تمام ہرزہ گردی سے کیا حاصل..... .. خیزو در کاسہ زر آب طربناک انداز"

یہ خط بالکل ذاتی ہے۔ اور یقیناً صاحب مکتوب کو یہ اندیشہ نہ رہا ہوگا کہ یہ الاصلاح کے صفحات میں معرض بحث میں آئے گا۔ لیکن بعینہٖ یہی خیال بار بار ہمارے بعض دوسرے احباب بھی اپنے خطوط میں اور بعض زبانی ظاہر کر چکے ہیں جس سے واضح ہے کہ یہ وقت کا ایک عام

سوال ہے اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس معاملہ کی نسبت ہم اپنے خیالات چند لفظوں میں ظاہر کر دیں تاکہ احباب پر واضح ہو جائے کہ ہم اس معاملہ کو کس روشنی میں دیکھتے ہیں۔

ہم ان دوستوں کے اس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ چونکہ علما میں اختلافات بہت ہیں، کوئی حنفی ہے، کوئی شافعی، کوئی حنبلی ہے کوئی مالکی، کوئی دیوبندی ہے، کوئی بریلوی اور کوئی اہلحدیث ہے اور کوئی اہل قرآن اور ہر جماعت کے الگ الگ ائمہ اور ان کی الگ الگ کتابیں ہیں اور ہر فرقہ اپنے مسلک اور طریق پر جامد اور دوسرے کے مسلک اور طریق سے متنفر ہے اس لئے توقع نہیں کہ کبھی اس منتشر شیرازہ کی تنظیم ہو سکے اور وہ تنظیم مستقبل میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی بنیاد قرار پا سکے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آج یہ سارے فتنے برپا ہیں اور ہندوستان کی گلی گلی میں برپا ہیں اور یہی فتنے ہیں جنھوں نے مسلمانوں کی ساری اجتماعی زندگی کچل ڈالی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہے کہ ان فتنوں سے مایوس ہو کر ہم اپنی ترقی کی جد وجہد کی باگ ایک بالکل مادی پروگرام کے ہاتھ میں دیدیں اور مذہب اور مذہبی جماعت کی رہنمائی سے یکقلم محروم ہو جائیں۔ یہ ایک نہایت ہی "شرمناک"، "افسوسناک"، "دردناک" (چاہے جو لفظ اس کے لئے استعمال کیجئے) حالت ضرور ہے اور "دل شکن" اور "مایوس کن" بھی سہی مگر ہر مسلمان کا بشرطیکہ وہ مسلمان ہے یہ فرض ہے کہ وہ اس شرمناک حالت سے مسلمانوں کو نکالنے کی تدبیریں سوچے۔ جو لوگ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں اور اسلام کے سچے ہونے کے منکر نہیں ہیں وہ اگر اس فتنہ کا علاج صرف یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی بنا پر چند طعن آمیز فقرے لکھ کر یہ مشورہ دیں کہ "یہ مذہب کا ڈھونگ چھوڑ دو" اور ایک معاشی اور اقتصادی پروگرام کو جو "کلمۂ سواد بینا و بیگم" کی حیثیت رکھتا ہے اختیار کر لو تو یقیناً ان کی مرعوب اور بزدلانہ ذہنیت اس فتنہ سے زیادہ شرمناک ہے۔ اور ہم کو اس مسئلہ پر غور کرنا پڑتا ہے کہ پہلے کس فتنہ کو ختم کیا جائے۔ اس فتنہ کو جس کی قدامت کی تاریخ کا رشتہ گو فتنۂ قتل عثمان سے

جڑا ہوا ہے لیکن شاید وہ اپنی قدامت ہی کی وجہ سے اب آہستہ آہستہ مضمحل ہو رہا ہے یا اس فتنہ کو جس نے یورپ کے سیاسی فلسفیوں کے بطن سے جنم لیا ہے اور اب وہ کھلم کھلا دین، اخلاق، عقل و انسانیت سب کی غارت گری پر کمربستہ ہے۔

غلط فہمی صرف اسی حد تک نہیں ہے کہ اس طرح کے فتنے موجود ہیں اس لئے مذہب سے دست بردار ہو جانا چاہئے بلکہ بہتوں کو یہ خیال بھی ہے کہ اس طرح کے فتنوں کا وجود مذہب کی ایک لازمی خصوصیت رہی ہے جو اس سے منفک نہیں ہو سکتی پس مذہب اور مذہبی جماعت کی رہنمائی میں منزل مقصود تک پہنچنا ناممکن ہے۔

یہ غلط فہمی دو چیزوں کا نتیجہ ہے، مذہب اسلام سے عدم واقفیت کا، اور ہمارے علما کی موجودہ غیر جماعتی اور منتشر زندگی کا۔ اور اصل ان دونوں کی ایک ہے کہ چونکہ ہمارے علما کی زندگی نے بالکل غیر شرعی جامہ اوڑھ لیا ہے اور وہ فتنوں کے سیلاب میں بہ گئے ہیں اس لئے جو لوگ مذہب کا مطالعہ بلا واسطہ نہیں کرتے وہ اس طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہوتے ہیں اور یہی چیز ہے جو آج الحاد و بے دینی کے تازہ فتنوں کو غذا دے رہی ہے اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ امت اس ورطۂ ہلاکت سے کب نکلے گی اور جمعیۃ علما جس کا نام جب کبھی ہم لیتے ہیں، انہی اچھی آرزوؤں کے ساتھ لیتے ہیں، اس معاملہ میں اس کی رہنمائی کس حد تک سود مند ہو گی!

مذہب اسلام کے متعلق ایک اصولی حقیقت جو ہمارے علما اور عوام دونوں کو معلوم ہے یہ ہے کہ اس کی بنیاد توحید پر ہے، یعنی ہم اس کائنات میں تمام تصرف، تمام اختیار، تمام قدرت صرف ایک، اللہ رب العالمین کے لئے مانتے ہیں۔ اسی نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے اس لئے اسی کی حکومت اس میں قائم ہے۔ الا له الخلق والامر۔ آگاہ! اسی نے خلق کیا اور اسی کی حکومت ہے۔ اس کی حاکمیت اور فرمانروائی (Sovereignty) بالکل غیر منقسم ہے۔

اگر اس میں کسی طرح کا انقسام ہوتا تو یہ آسمان و زمین اپنی جگہ پر قائم نہ رہتے۔ یہ سارا نظام جو وحدت و ہم آہنگی کا ایک خوبصورت ترین نظام ہے درہم برہم ہو جاتا۔ قرآنمجید نے سورہ انبیاء میں اسی غیر منقسم فرمانروائی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

لَوْكَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ	اگر آسمان و زمین میں خدا کے سوا دوسرے معبود
لَفَسَدَتَا	بھی ہوتے تو یہ آسمان و زمین درہم برہم ہو جاتے

اور یہی حقیقت سورہ بنی اسرائیل میں کسی قدر مختلف الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

قُلْ لَّوْكَانَ مَعَهٗ اٰلِهَةٌ كَمَا	کہدو اگر اس کے ساتھ اور حاکم بھی ہوتے جیساکہ
يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى	یہ کہتے ہیں تو وہ عرش والے پر بغاوت کی راہ
ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا	ڈھونڈھتے۔

اور پھر یہی حقیقت سورہ مومنون میں بالکل واضح ہو گئی ہے۔

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا	اللہ کے کوئی بیٹا نہیں اور نہ کوئی معبود اس کا
كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ	ساجھی ہے اگر یوں ہوتا تو ہر معبود اپنی
كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ	مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا اور ایک دوسرے
عَلٰى بَعْضٍ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا	پر چڑھ دوڑتا، پاک ہے اللہ ان باتوں سے
يَصِفُوْنَ	جو یہ بیان کرتے ہیں۔

یعنی اس کائنات کی ہم آہنگی اور اس کا وجود اسی وجہ سے قائم ہے کہ اس کا خالق اور مالک ایک ہے جس کی حاکمیت غیر منقسم ہے۔ اگر یہ حاکمیت منقسم ہوتی تو یہ آسمان و زمین قائم نہ رہ سکتے۔ سارا نظام مختل ہو جاتا۔ ہماری سیاست کی محدود دنیا میں غیر منقسم حاکمیت کا جو اصول مسلم ہے اور جس کو منتشر کر کے ہم کسی اجتماعی نظام کا تصور نہیں کر سکتے، اسی اصول کی روشنی میں قرآن نے

توحید کی حقیقت کو سمجھایا ہے اور کس قدر مختصر مگر جامع لفظوں میں سمجھایا ہے۔

پھر جو وحدت اس تمام کائنات میں ہے ضرور ہے کہ وہی وحدت اس کائنات کے اس چھوٹے سے جزو میں بھی ہو جس کا نام زمین ہے اور جس کے اندر ہم بستے ہیں۔ یعنی ضروری ہے کہ ہم ایک ہی کی حاکمیت اور فرمانروائی کو تسلیم کریں ورنہ جس طرح حاکمیت کی تقسیم مجموعی کائنات کو تباہ کر دیتی اسی طرح حاکمیت کی تقسیم اس زمین کے نظام کو بھی درہم برہم کر دے گی۔ یہی نکتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان الحکم الا للہ کی تعلیم دی اور شرک کو فساد فی الارض سے تعبیر فرمایا۔ سورہ اعراف کی یہ آیت اس نکتہ کو سمجھانے کے لئے نہایت اہم ہے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً	اپنے رب ہی کو پکارو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے
اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۔ وَلَا	بیشک وہ حدود سے آگے بڑھنے والوں کو دوست
تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ	نہیں رکھتا اور زمین میں اس کی اصلاح کے
اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا	بعد فساد مت ڈالو اور اسی کو پکارو خوف سے
وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ	اور طمع سے، بے شک اس کی رحمت نیکوکاروں
قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ	سے قریب ہے۔

اس آیت کے تمام پیش و عقب پر جو شخص تدبر کرے گا وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اس بات کو معلوم کرے گا کہ اس میں جس فساد فی الارض سے روکا گیا ہے وہ شرک ہے۔ لاتفسدوا فی الارض میں جس بات کو منفی پہلو سے کہا گیا ہے وہی بات ہے جو وادعوہ خوفا وطمعا میں اثباتی پہلو سے کہی گئی ہے۔

شرک، فساد فی الارض کیوں ہے؟ اس کے بہت سے وجوہ ہیں جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے لیکن ایک پہلو جو نہایت ہی واضح ہے اور جو ہمارے آیندہ مباحث کی تمہید ہے

یہ ہے کہ شرک ایک خدا کی اور اس کے ایک قانون کی حاکمیت کو مٹا کر خلق کو بے شمار خداؤں اور مختلف قانونوں کی الگ الگ جتھ بندیوں میں تقسیم کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ زمین جو ایک خدا کی مخلوق اور ایک نسل آدم کا گہوارہ ہے مختلف نسلوں اور بے شمار بتوں اور ان کے پجاریوں کی ایک رزمگاہ بن جاتی ہے اور ساری زمین کا امن و عدل غارت ہو جاتا ہے۔ اس دعوی کا محسوس ثبوت ہم پرانی تاریخ میں متمدن یونان اور روم میں بھی دیکھ سکتے ہیں جن کی شہری حکومتیں الگ الگ "ہاتفوں" سے الہام حاصل کرتی تھیں اور جاہل و غیر متمدن عرب میں بھی دیکھ سکتے ہیں جن کے قبیلے قبیلے کے جدا جدا بت تھے۔ اور موجودہ متمدن دنیا میں بھی اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں جو یونان اور عرب کے بتوں کی جگہ وطن اور نسل اور رنگ کے بتوں کو پوجتی ہے اور ان کے ناموں پر جتھے بنا کر ہر وقت آگ اور خون کی ہولی کھیلنے اور امن و عدل کو تباہ کرنے کیلئے مسلح ہے پھر اسی فساد فی الارض کے اندر ان کی تباہی کا راز بھی مضمر ہے۔ یونان کی ابتدائی شہری حکومتوں کو ان کی باہمی جنگوں نے تباہ کیا کہ مختلف دیوتاؤں کے لئے ضروری تھا کہ وہ لعلا بعضہم علی بعض کے قانون کو پورا کریں۔ موجودہ دنیا کی حکومتیں بھی جو پرانی حکومتوں کی طرح الگ الگ نسلوں زبانوں اور وطنوں سے الہام حاصل کر رہی ہیں، انھوں نے زمین کو جس طرح فساد سے بھر دیا ہے وہ ہر نگاہ کے سامنے ہے اور آئندہ جو کچھ آنے والا ہے اس کے تصور سے خود ان آلہۂ فساد کے جسم لرز رہے ہیں۔ عرب کا حال بھی ہم سے مخفی نہیں کہ ان کی زمین کا کوئی گوشہ بھی نہ تھا جو امن و عدل سے آشنا ہوتا۔ ہر قبیلہ کا خدا اور قانون الگ الگ اور سارا ملک شیطان اور اس کے شر و فساد کا جہنم۔ بالآخر اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کی طرف متوجہ ہوئی اور ان کو اس جہنم سے نجات دی گئی جس کا قرآن مجید نے ان لفظوں میں ذکر فرمایا۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا   اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوط پکڑو اور

وَلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ
اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً
فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ
بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ج وَكُنْتُمْ عَلٰى
شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ
فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ
يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ
تَهْتَدُوْنَ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ
اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ
وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَلَا تَكُوْنُوْا
كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا
مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ
وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ
عَظِيْمٌ (۱۰۳ - ۱۰۵ آل عمران)

باہم متفرق نہ ہو اور اپنے اوپر اللہ کی
نعمت کو یاد کرو جبکہ تم باہم ایک دوسرے
کے دشمن تھے پس اللہ نے تمہارے دلوں کو
جوڑا پس تم اس کے فضل سے بھائی بھائی
بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تھے
پس اللہ نے تم کو اس سے نکالا اسی طرح
اللہ اپنی آیتیں تمہارے لئے کھول کر بیان
کرتا ہے تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔ اور چاہئے
کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو بھلائی کی دعوت
دے، معروف کا حکم دے اور برائی سے
روکے وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔
ان لوگوں کی طرح نہ بنا جو متفرق ہو گئے
اور انہوں نے اختلاف کیا بعد اس کے
کہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں آگئیں
اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔
....

ہمارے علما اس آیت پر غور کریں یہ آیت ان کے ماضی و مستقبل کا آئینہ ہے۔ اس میں ہماری پہلی حالت یہ بیان کی گئی ہے کہ ہم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے اور جہنم کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، پھر اللہ کی رحمت ہم پر متوجہ ہوئی اور ہم کو اس کی ایک ہی رسی نے

باہم گر جوڑ کر بھائی بھائی بنا دیا۔ پھر اس میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اگر ہم پہلی عداوت کے عذاب میں مبتلا ہونا چاہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم سب ملکر اس رسی کو مضبوطا پکڑے رہیں۔ کیونکہ اگر ہم نے اس کو چھوڑا تو پھر تربتر ہو کر اسی جہنم کے گڑھے کے کنارے پہنچ جائیں گے جس سے خدا کی رحمت نے ہم کو رہائی دی تھی۔ پھر یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس حالت پر مضبوط و استوار قائم رہنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک طاقتور جماعت   اصحاب امر و نہی اور ارباب حل و عقد کی ایسی ہونی چاہیے جو برابر نیکی کے اصولوں کا حکم دیتی رہے اور برائیوں کو چھانٹتی رہے کہ برائیاں ہماری زندگی پر چھا نہ جائیں اور آخر میں یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ دیکھو ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جن کے ہاتھوں میں تمہاری ہی طرح خدا کی رسی دی گئی تھی مگر وہ اس کو چھوڑ کر الگ الگ ہو گئے اور جس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ ان کے آپس میں اختلاف مچ گیا اور وہ خدا کی روشنی پاکر تاریکی میں بھٹک گئے۔

یہ رسی کیا ہے؟ اس کا صحیح جواب ایک ہی ہے کہ قرآن! خدا اور بندوں کے درمیان رشتہ جوڑنے والی رسی یہی ہے جو آسمان سے زمین تک لٹک رہی ہے۔ یہی قرآن ہے جو ہمارے درمیان اور خدا کے درمیان میثاق اور عہد ہے۔ ہم ایک خدا کے ماننے والے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اسی ایک کے امر و حکم کو مانتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر ہم کسی کا حکم مانیں تو ہم خدا کی حاکمیت کو تقسیم کر کے فساد فی الارض کے مجرم ہوں گے اور فساد فی الارض کے مجرم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ ان کے لئے تباہی اور ہلاکت ہے۔ واولئک لھم عذاب الیم۔

ولاتکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا میں یہود و نصاریٰ کی راہ اختیار کرنے سے روکا گیا ہے۔ مناسب ہوگا کہ یہاں مختصراً یہود و نصاریٰ کے طرز عمل کو بھی سمجھ لیا جائے تاکہ قرآن مجید کی تنبیہ پوری طرح سمجھ میں آ سکے۔

یہود کے متعلق قرآن مجید نے جگہ جگہ یہ فرمایا ہے کہ ان کو جو کتاب دی گئی اس کو انھوں نے چھپایا، اس میں انھوں نے تحریف کی۔ انھوں نے اپنی کتاب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، اس کو انھوں نے پس پشت ڈالدیا، یہاں تک کہ اس کو چھوڑ کر اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ (۳۱ توبہ) انھوں نے اپنے احبار و رہبان کو خدا کے سوا معبود بنالیا۔ اس آیت کی تاویل میں جو روایت ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کاہنوں اور علماء کے احکام نے کتاب الٰہی کی جگہ لے لی تھی اور اس طرح وہ اس نقض میثاق اور فساد فی الارض کے مرتکب ہوئے جس کی سزا خدا نے ان کو لعنت کی صورت میں دی۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ	پس ان کی عہد شکنی کی سزا میں ہم نے
لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ	ان پر لعنت کی اور ان کے دل سخت
قَاسِيَةً	کر دیئے۔

یہ نقض میثاق کتاب الٰہی کا ترک و نسیان ہے اور یہی چیز ہے جس کی بنا پر قرآن نے جگہ جگہ یہود کو فساد فی الارض کا مجرم قرار دیا۔ ولتفسدن فی الارض مرتین ولتعلن علوا کبیرا۔

ٹھیک یہی حال نصاریٰ کا ہوا۔

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّا نَصٰرٰى	اور ان سے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں
اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا	ہم نے میثاق لیا پس وہ اس کا ایک حصہ
حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَاَغْرَيْنَا	بھلا بیٹھے جس کے ذریعہ ان کو یاد دہانی کی
بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ	گئی (یعنی کتاب) پس ہم نے ان کے درمیان
اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ	قیامت تک کیلئے عداوت اور بغض کی آگ بھڑکا دی۔

"میثاق لیا" یعنی کتاب دی اور اس کے قیام و اہتمام اور اس کی پیروی و پابندی کا عہد لیا۔ لیکن یہ بھی اس کو بھلا بیٹھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیامت تک کے لئے ان کے درمیان بغض و عداوت کی آگ بھڑک اٹھی اور خدا کی زمین میں اصلاح کے بعد فساد پیدا ہو گیا۔

اس کی وجہ نہایت صاف ہے کہ کتاب الٰہی روشنی ہے اگر روشنی گل ہو جائے تو اندھیرے میں ایک کا دوسرے سے ٹکرانا اور اختلاف و نزاع کا برپا ہونا ناگزیر ہے۔ مولانا روم نے اس حقیقت کو اپنی مثنوی کی ایک تمثیل میں نہایت خوبی سے سمجھایا ہے۔ اور قرآن مجید نے کتاب الٰہی کو سورہ حدید میں میزان سے تعبیر فرما کر اس معاملہ کو ایک دوسرے پہلو سے بھی واضح کر دیا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا	اور ہم نے اپنے انبیاء بھیجے روشن دلائل
بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ	کے ساتھ اور اتاری ان کے ساتھ کتاب
وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ	اور میزان تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں۔
بِالْقِسْطِ	....

اس بات کی نہایت لطیف تائید سورہ رحمٰن کی ابتدائی آیات سے بھی ہوتی ہے۔ جہاں قرآن کو اسی طرح زمین کے عدل و توازن کے لئے میزان قرار دیا گیا ہے جس طرح آسمان و زمین کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک میزان رکھی ہے اور جس کی وجہ سے وہ دونوں قائم ہیں۔ پس اس حقیقت کے سامنے آنے کے بعد کہ کتاب الٰہی میزان ہے اور اس کا نزول لوگوں کے قسط و عدل پر قائم رہنے کیلئے ہے یہ بات بالکل صاف واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے بھلا دینے اور پس پشت ڈال دینے کے بعد عداوت و بغض اور فساد فی الارض کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔

اس توضیح سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ دنیا میں جو قومیں کتاب الٰہی کی وراثت اور میثاق الٰہی سے سرفراز کی گئی تھیں انھوں نے کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال دیا اور اس طرح و

حبل اللہ منقطع ہوگئی جو انسانیت کے اجتماع وتالیف کے لئے اور عبد ومعبود کے رشتہ کو قائم رکھنے کے لئے آسمان سے لٹکائی گئی تھی اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر ایک قانون کی حاکمیت اور زمین کا وہ توازن مختل ہوگیا جو اس کے تمام انتشار کے لئے وحدت اور تمام تفرق کیلئے اجتماع وائتلاف کا شیرازہ تھا۔

اس کے بعد خدا کی رحمت زمین کی طرف پھر متوجہ ہوئی اور وہ ٹوٹا ہوا رشتہ رحمت الٰہی سے قائم ہوا اور حکم ہوا کہ واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا خدا کی اس رسی کو سب ملکر مضبوط پکڑو اور متفرق نہ ہونا یعنی اس کو چھوڑنا مت۔ اس کو چھوڑنا تفرق اور انتشار ہے۔ یہی رشتہ تم کو خدا سے وابستہ رکھے گا اور پھر یہی چیز ہے جو تمھارے آپس کے میل ملاپ اور اتحاد ویکجہتی کی بنیاد ہے۔ یہ بنیاد جہاں کمزور ہوئی تمھاری ساری عمارت ڈھے جائیگی اور زمین پھر شیطان کے قبضہ میں چلی جائے گی۔

اس حبل اللہ المتین کے رشتۂ وحدت نے جس امت کو مجتمع کیا اس کے نزدیک یہ بات آفتاب سے زیادہ روشن تھی، کہ تمام آسمان وزمین کی حاکمیت کا مرکز اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ پس اسی کی اتاری ہوئی کتاب اور اسی کے بھیجے ہوئے قانون کی حاکمیت زمین میں ہونی چاہئے۔ جو اس میں حرام ہے وہ حرام ہے، اور جو اس میں حلال ہے وہ حلال ہے۔ اس کے علاوہ کسی کو حق نہیں کہ اپنے جی سے کسی چیز کو حرام وحلال قرار دے اور اپنے اختراع واختیار سے خدا کے بندوں پر کوئی قانون نافذ کرے۔ ایسا کرنا خدائے واحد کے قانون کی حاکمیت میں ساجھا بٹانا ہے جو مومن کی خصوصیت نہیں ہے، ان مشرکین کی خصوصیت ہے جو اپنی طرف سے حرام وحلال کرتے تھے۔ اور جن کے اسی جرم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان سے زمین کا اقتدار چھینا اور مسلمانوں کو سونپا۔

پس مسلمانوں کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کتاب کا علم و عمل ان کی زندگی کا اصلی مقصود قرار پاگیا تھا۔ وہ اس کو پڑھتے تھے، اس پر غور کرتے تھے اور اس کی مشکلوں اور دقتوں کو حل کرنے کے لیے باہم مذاکرے کرتے تھے۔ رات کی خلوتوں اور دن کی جلوتوں میں یہی چیز تھی جو ان کے دل کی راحت اور روح کی طمانیت تھی۔ وہ اس کی ایک ایک آیت کو لیتے اور جب تک اس کے علم کو اپنے قلب و روح پر اور اس کے عمل کو اپنے اعضاء و جوارح پر طاری نہ کر لیتے اس سے آگے قدم نہ بڑھاتے۔

عن ابن مسعود قال کان	ابن مسعود نے فرمایا کہ ہم میں سے کوئی شخص
الرجل منا اذا تعلم عشر	قرآن کی دس آیتیں بھی سیکھ لیتا تو ان سے
ایات لم یجاوزھن حتی	آگے نہ بڑھتا تا آنکہ ان کے معانی کو سمجھ
یعرف معانیھن والعمل بھن	نہ لے اور ان پر عمل نہ کر لے۔

اس علم کی قدر و قیمت کا یہ حال تھا کہ یہی عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں۔

ولو اعلم احدا اعلم	اگر میں کسی ایسے کا پتہ پاتا جو مجھ سے
بکتاب اللہ منی تنالہ المطایا	زیادہ کتاب اللہ کا عالم ہوتا اور سواریوں
لاتیتہ	سے اس تک پہنچنا ممکن ہوتا تو میں ضرور اس کے پاس پہنچتا۔

اور پھر یہی کتاب تھی جو سرِ دفتر حکم و قضا تھی۔ قضاۃ و ارباب افتاء کے سامنے جب بھی کوئی معاملہ پیش آتا وہ سب سے پہلے اسی کتاب کی طرف رجوع کرتے۔

عن معاذ انہ قال لما بعثنی	معاذ بن جبل سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	کہ جب مجھے رسول اللہ صلعم نے یمن بھیجا
الی الیمن قال کیف تقضی اذا	تو دریافت فرمایا کہ جب تمہارے سامنے

عرض لك قضاء قال اقضي	کوئی معاملہ آئیگا تو اس میں کیسے فیصلہ کروگے؟
بكتاب الله قال فان لم يكن	میں نے جواب دیا اللہ کی کتاب سے۔ فرمایا اگر اللہ
في كتاب الله قال فبسنة	کی کتاب میں کوئی واضح بات نہ ملے۔ جواب دیا
رسول الله صلى الله عليه وسلم	رسول اللہ کی سنت سے۔ فرمایا اگر اس میں
قال فان لم يكن في سنة	بھی کوئی واضح بات نہ ملے؟ جواب دیا پھر میں
رسول الله قال اجتهد رايي	اپنی عقل سے اجتہاد کروں گا اور اس اجتہاد
ولا آلو قال فضرب رسول الله	عقل میں کسی طرح کی کوتاہی نہ ہونے دوں گا
صلى الله عليه وسلم صدره	پھر رسول اللہ صلعم نے ان کے سینہ پر ہاتھ مارا
قال الحمد لله الذي	اور فرمایا اس خدا کا شکر ہے جس نے اللہ کے
وفق رسول رسول الله	رسول کے رسول کو اس بات کی توفیق دی
لما يرضي رسول الله	جو اللہ کے رسول کو پسند ہے

بعینہٖ یہی بات حضرت عمر بن الخطابؓ نے شریح قاضی کو لکھی۔

اذا وجدت شيئا في كتاب الله	جب تمھیں کتاب اللہ میں کوئی بات مل جائے
فاقض به ولا تلتفت الى	اس کے مطابق فیصلہ کرو اور اس کے علاوہ
غيره واذا اتى شيء ليس في	کسی چیز کی طرف متوجہ مت ہو اور جب ایسی
كتب الله وليس في سنة	صورت ہو کہ اس کے متعلق نہ کتاب اللہ میں
رسول الله ولم يقل فيه	کوئی بات موجود ہو نہ سنت رسول اللہ میں
احد قبلك فان شئت	نہ اس بارہ میں تمھارے کسی سابق کا قول ہو
ان تجتهد رايك فتقدم	تو اگر تم اجتہاد کرنا چاہو تو آگے قدم بڑھاؤ

وان شئت ان تتاخر فتاخر	اور اگر تم چاہو تو توقف کرو اور یہ توقف میں
ما اری التاخر الا خیرا لک	تمہارے لئے بہتر ہی سمجھتا ہوں۔

بعینہٖ اسی مضمون کی روایات، کچھ الفاظ کے تغیر اور بعض مطالب کی تشریح کے ساتھ، عبداللہ بن مسعود، ابن عباس، اور حضرت علی رضی اللہ عنہم وغیرہ سے ہیں۔ ان تمام روایات سے یہ واضح ہے کہ خیر القرون میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کی طرح کتاب اللہ کی حاکمیت بالکل مسلم تھی۔ ہر معاملہ میں پہلی سند اور اولین مرجع وہی چیز تھی۔ ہر قاضی اور مفتی کے سامنے جب کوئی ایسی حالت پیش آتی جس میں اس کو کوئی حکم لگانا ہوتا تو وہ سب سے پہلے اسی کے منصوصات میں ہدایت ڈھونڈھتا، جب اس میں اس کو کوئی واضح بات نہ ملتی تو پھر سنت رسول اللہ اور اجتہاد رائے کا دروازہ کھٹکھٹاتا۔

اور یہ سنت رسول اللہ اور اجتہاد رائے کوئی ایسی چیز نہ تھی جو کتاب اللہ پر قاضی ہو یا اس سے کوئی علحدہ چیز ہو۔ سنت رسول اللہ سرتاسر کتاب الٰہی کی تبیین و تفسیر ہے ۔۔ باتیں کتاب الٰہی کے اشارات ...... میں مضمر تھیں ان کو رسول اللہ کی سنت نے کھول دیا ہے۔ پس اس کا تمسک درحقیقت کتاب الٰہی کا تمسک ہے۔ وہ کتاب اللہ کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے۔ خیرالقرون کے علماء اور بعد کے ارباب نظر نے معاملہ کو یوں ہی سمجھا ہے اور صحیح رائے یہی ہے۔ اس کے خلاف جن نے کوئی بات کہی ہے وہ یا تو حمایت کا غلو ہے یا انکار کی سرکشی اور یہ دونوں راہیں باطل کی ہیں۔

عن عمران بن حصین انہ	عمران بن حصین سے روایت ہے کہ انھوں
قال لرجل انک امرء احمق	نے ایک شخص سے کہا کہ تم بالکل احمق آدمی
اتجد فی کتاب اللہ الظہر	ہو، بھلا کتاب اللہ میں کہیں ہے کہ ظہر چار رکعت
اربعا لا تجھر فیہا بالقراءۃ	ہے اور اسمیں قرأت جہری نہ ہو پھر اسی

ثم عدد عليه الصلوٰة	طرح اور نمازیں اور زکوٰۃ وغیرہ کے قسم کی
والزکوٰۃ ونحو هذا ثم قال	چیزیں گنائیں اور پوچھا کیا ان کے بارہ میں
اتجد فی کتاب الله مفسرا؟	کتاب اللہ میں پوری تفصیل ہے؟ کتاب اللہ
ان کتاب الله ابهم هذا وان	میں یہ چیزیں مجملاً بیان ہوئی ہیں اور سنت رسول اللہ
السنة تفسر ذلك	میں ان کی پوری تفصیل ہوگئی ہے۔

ایک دوسری روایت ہے۔

عن ايوب ان رجلا قال لمطرف	ایوب سے روایت ہے کہ ایک شخص نے مطرف
بن عبد الله ابن الشخير	بن عبداللہ ابن الشخیر سے کہا کہ ہم سے قرآن
لا تحدثونا الا بالقرآن	کے علاوہ کچھ نہ بیان کرو، مطرف نے کہا خدا کی
فقال له مطرف والله ما	قسم ہم یہ نہیں چاہتے کہ قرآن کا کوئی بدل
نريد بالقرآن بدلا ولكن	پیش کریں ہم تو صرف اس کی بات پیش کرنا چاہتے
نريد من هو اعلم بالقرآن منا	ہیں جو ہم سے زیادہ قرآن کا عالم تھا۔

اور جن علماء کا یہ مذہب ہوا کہ "ان السنة قاضية على الكتاب" سنت کتاب اللہ پر قاضی و آمر ہے تو جیسا کہ ہم نے اوپر کہا محض غلو کا نتیجہ ہے اور حدیث و سنت کے سب سے بڑے حامل احمد بن حنبل رح نے اس باب میں جو بات فرما دی ہے وہ بالکل آخری و قطعی ہے۔

قال الفضل بن زياد سمعت	فضل بن زیاد کہتے ہیں کہ احمد بن حنبل سے ان
ابا عبد الله يعني احمد بن	"السنة قاضية" والی حدیث کی نسبت سوال
حنبل وسئل عن الحديث	کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں یہ کہنے کی
الذی روی ان السنة	جرأت نہیں کرسکتا کہ سنت کتاب اللہ پر

قاضیة علی الکتاب فقال
ما اجسر علی هذا ان اقوله
ان السنة قاضیة علی الکتب
ان السنة تفسر الکتاب و
تبینه قال الفضل وسمعت
احمد بن حنبل یقول لا
تنسخ السنة شیئاً من القرآن
قال لا ینسخ القرآن الا القرآن

قاضی و آمر ہے البتہ یہ بات ہے کہ سنت کتاب
اللہ کی تفسیر و توضیح کرتی ہے۔ فضل کہتے ہیں
کہ احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ سنت قرآن کی
کسی بات کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ قرآن کو
صرف قرآن منسوخ کر سکتا ہے ....

بعینہ یہی مذہب حضرت امام شافعیؒ اور جمہور اصحاب مالکؒ کا ہے۔

لیکن ایک بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ سنت قرآن کی ایسی تفسیر ہے جو ایک معصوم کی طرف سے کی گئی ہے جس کا اجتہاد بے خطا اور جس کا استنباط بالکل قطعی اور غیر مشتبہ ہے اس لئے نہ صرف یہ کہ ہم اس کو کتاب کا ایک ناقابل انکار جزو سمجھتے ہیں بلکہ خود اس کی جزئیات سے اصول و کلیات مستنبط کر کے بعینہ اسی طرح ان اصول و کلیات کی روشنی میں تفریع و تخریج مسائل کر سکتے ہیں جس طرح قرآن سے مستنبط کلیات کی روشنی میں کرتے ہیں۔ یہ پایہ کتاب اللہ کے بعد صرف سنت رسول اللہ کو حاصل ہے اور سنت رسول اللہ کے سوا کسی امام و مجتہد کے اجتہادات و استنباطات کو یہ درجہ حاصل نہیں ہے کہ اس کے قرارداده اصول ہمارے نئے اصولوں کے ... بننے کیلئے سانچے کا کام دیں یا اسکی جزئیات سے کلیات بنا کر ہم ان کلیات کو تخریج مسائل کی بنیاد قرار دے سکیں۔

اب "اجتہاد بالرائے" کی حقیقت بھی سمجھ لینی چاہیے۔

اجتہاد رائے کتاب و سنت کے منصوصات، ان سے مستنبط کلیات اور ان کی پھیلی ہوئی روشنی میں رشد و ہدایت کی جستجو کا نام ہے۔ خیر القرون میں یہ منصب ہر شخص کے لیے نہ تھا صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص تھا جو دین میں تفقہ اور اجتہاد کا مرتبہ رکھتے تھے اور اس رمز سے آشنا تھے کہ روز کے پیش آنے والے حالات و معاملات میں کس طرح کتاب و سنت کی رہنمائی حاصل کرنی چاہیئے۔ یہ اخیار کتاب و سنت کے مزاج میں درخور رکھتے تھے ان کے فلسفہ کے محرم اسرار، ان کے نکتوں کے رمز آشنا، اور مومنانہ فراست اور تقوی کی دولت حیات سے پوری طرح مالا مال تھے۔ یہ فتوی اور قضا کی ذمہ داریوں سے بھی باخبر تھے اور اس باب میں احادیث میں جو وعیدیں وارد ہیں ان سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ پیغمبر نے فرمایا ہے اجرؤکم علی الفتیا اجرؤکم علی النار تم میں فتوی دینے میں جو شخص سب سے زیادہ جری ہے وہ جہنم کی آگ میں پھاندنے کے لیے سب سے زیادہ دلیر ہے۔ اس کی وجہ سے ان کا حال یہ تھا کہ براء فرماتے ہیں کہ میں انصار میں سے ایک سو بیس ایسے اصحاب رسول اللہ سے ملا جن کا حال یہ تھا کہ جب ان سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا کہ کاش اس کے بتانے کی ذمہ داری دوسرا لے لے۔

عمر بن عبدالعزیز خلیفہ تھے اور ان کے منصب کی ذمہ داریوں میں سے یہ بات بھی تھی کہ پیش آنے والے معاملات میں فتوے دیں اور اگر ان کے قضاۃ و عمال کسی معاملہ میں ان سے رجوع کریں تو ان کی رہنمائی کریں تاہم ان کے احتیاط و تورع کا یہ عالم تھا کہ جب ان سے ان کے ایک عامل نے رجوع کیا تو اس کو لکھا واللہ ما انا بحریص علی الفتیا ما وجدت منہ بدا خدا کی قسم جب تک میرے لئے فتوے سے فرار کی گنجائش نکل سکے میں اس کا خواہش مند نہیں ہوں۔ تمہارا علم اس ذمہ داری کے لئے کافی ہے۔ انہی کا ارشاد ہے کہ

اعلم الناس بالفتویٰ اسکتہم واجہلہم بہا انطقہم۔ سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ فقہا کا یہ حال تھا کہ وہ جب تک فتوی دینے کی ذمہ داریوں سے بچ سکتے تھے فتوی سے گریز کرتے تھے، اسی وقت اس بارگراں کو اٹھاتے تھے جب اس کے لئے بالکل مجبور ہوجائیں۔ حضرت احمد بن حنبلؒ فرماتے تھے کہ جس شخص نے اپنے تئیں فتوی کے لئے پیش کیا اس نے بہت بڑی ذمہ داری اٹھالی، مفتی کو یہ بات جاننی چاہیئے کہ وہ اللہ کی طرف سے امر و نہی کا اعلان کررہا ہے اور وہ اس بارہ میں مسئول ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم لوگ ہم سے فتوی پوچھتے ہو اور ہماری خواہش یہ ہوتی ہے کہ کاش یہ بات ہم سے نہ پوچھی جاتی۔ حضرت امام مالکؒ سے جب کوئی فتویٰ پوچھا جاتا تو معلوم ہوتا کانہ واقف بین الجنۃ والنار، گویا جنت اور دوزخ کے درمیان کھڑے ہیں۔ سلف سے اس طرح کے اقوال وارشادات کا ایک دفتر منقول ہے۔ اسکی وجہ یہی تھی کہ جس باب میں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں کوئی واضح ہدایت نہ ہو اس میں تحری کرکے اللہ ورسول کی مرضی سے اوفق بات معلوم کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہ تھا وہ جانتے تھے کہ یہاں کتاب اللہ کی حاکمیت کا سوال ہے اگر اس میں کسی طرح کا رخنہ پیدا ہوا، تو پھر یہ شرک اور توحید کا معاملہ ہے اور اللہ تعالی شرک کو کبھی معاف نہ فرمائے گا۔ اگر ان کے سامنے بھی الگ الگ اماموں کی مرتب فقہیں ہوتیں اور بغیر علم واطلاع ان سے ایک بات نقل کرکے کفر وایمان کا فیصلہ کردینا ہوتا یا ان کے صحیح وسقیم اصولوں پر صرف تخریج در تخریج کی عمارت کھڑی کردینا مدار فقاہت واجتہاد قرار پاگیا ہوتا تو یقیناً معاملہ بہت سہل تھا۔ وہ ایک ہی دن میں، توحید، کتاب الہی، اور امت سب کے بخیے ادھیڑ کے رکھ دے سکتے تھے۔ اور ملت کی تباہی کو اتنے دن انتظار کی زحمت نہ دیتے۔

افتا وقضا تو درکنار وعظ گوئی کا مجاز بھی خیر القرون میں ہر شخص نہ تھا

ابوداؤد میں روایت ہے۔

عن عوف بن مالك	عوف بن مالک الاشجعی راوی ہیں کہ
الاشجعی قال سمعت	میں نے رسول اللہ صلعم کو فرماتے سنا کہ
رسول اللہ صلعم یقول لا یقص	وعظ نہ کہے مگر امیر یا وہ شخص جو اس کی طرف
الا امیر او مامور او مختال (ابوداؤد باب فی القصص)	سے مامور ہو یا پھر اکڑنے والا۔

منصب قضا کے متعلق جو الفاظ ہیں وہ خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہیں عبد اللہ بن مسعود فرماتے ہیں فمن ابتلی بقضاء بعد الیوم فلیقض . . . . جو اب قضاء کی آزمائش میں ڈالا جائے تو وہ یوں کرے۔ من عرض له منه قضاء جس کے سامنے قضاء کی ذمہ داری آئے وہ یہ کرے۔ قاضی شریح اور معاذ کو جو ہدایت ہوئی وہ بھی اسی نوعیت سے تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ ہر شخص اپنے طور پر جہاں چاہے وعظ کہہ دے اور جو چاہے فتویٰ لکھ دے جب لوگوں کے سامنے کوئی معاملہ پیش آتا امیر یا اس کے مامور کے سامنے پیش کرتے وہ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کا فیصلہ کر دیتے۔ اور اگر معاملہ مشکل ہوتا، اس باب میں کتاب و سنت کی کوئی صریح روشنی موجود نہ ہوتی تو امیر دوسرے ارباب تفقہ واجتہاد کی شوریٰ بلاتا اور ان سے مشورہ لیتا، جب ایک بات طے ہو جاتی، اس کا اعلان کر دیا جاتا اور وہ بات گویا وقت کے اخیار اور ارباب بست وکشاد یا قرآن کے الفاظ میں اولو الامر کی مجمع علیہ بات ہوتی اور یہی اجماع کی حقیقت ہے، پھر سب اسی کو مانتے اور اسی کے مطابق فیصلے ہوتے۔

اخرج الدارمی عن المسیب	مسیب بن رافع فرماتے ہیں کہ جب کوئی
بن رافع قال کانوا اذا نزلت	ایسا معاملہ پیش آتا جس کے متعلق رسول اللہ
فیهم قصة لیس فیها عن	سے کوئی اثر مروی نہ ہوتا تو اس کیلئے

رسول اللہ اشرا جتمعوا ارباب حل وعقد مجتمع ہوتے اور ایک متفق علیہ
لہا واجمعوا فالحق فیما راؤا بات طے کرتے پس حق اسی بات میں ہوتا جو وہ طے کرتے۔

اس طرح کے مجمع علیہ مسائل کی نوعیت بالکل دوسری تھی اور قضاۃ وارباب افتا ضرورت کے وقت ان کی طرف رجوع کرتے یہی چیز ہے جس کی طرف حضرت عمرؓ نے اپنے اس نامہ میں اشارہ فرمایا ہے جو قاضی شریح کو لکھا ہے "ولم یقل فیہ احد" "اور اس بارہ میں کسی پیشرو کا قول بھی نہ ہو" اس قول سے مراد کسی شخص کا انفرادی قول نہیں ہے بلکہ اولوالامر کا کوئی مجمع علیہ فیصلہ مراد ہے۔ انفرادی اقوال اگرچہ صحابہ کے ہوں کوئی حجت نہیں۔ اس باب میں صحیح مسلک میرے نزدیک انہی لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ ان الاختلاف اذا وقع فہو خطاء وصواب۔ صحابہ کے اقوال بھی جب باہمدگر متصادم ہو جائیں تو ان میں غلط اور صحیح دونوں ہیں اور ان میں صحیح کی تعیین کتاب وسنت کی کسوٹی سے ہوگی۔ یہی مذہب امام مالکؒ امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب کا ہے۔ وہو الحق عندی۔

اور حضرت ابن عباسؓ کے متعلق مروی ہے کہ وہ سنت رسول اللہ کی عدم موجودگی میں حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما کے اقوال کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ بحیثیت امیران کے فتوی شوری کے مجمع علیہ فتوے تھے۔ والحق فیما راوا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا کہ اگر میری سنت نہ پاؤ تو "اجعلوہ شوریٰ بینکم ولا تقضوا فیہ برای واحد" ممکن ہے لفظاً صحیح نہ ہو مگر خیر القرون کا عمل اور دوسری روایات اس کے معنی کی تصدیق کرتی ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو گئی ہوگی کہ خیر القرون میں مسلمانوں کے ظاہری اور باطنی، عقلی ومادی نظام میں کامل وحدت تھی، وہ ایک خدا کو مانتے تھے، اس کے

رسول کو مانتے تھے اور اپنے اولوالامر کو مانتے تھے۔ خدا نے قانون دیا تھا، رسول کی سنت نے اس کی تشریح فرمائی تھی، اور اولوالامر اس کے قیام و تنفیذ کے ذمہ دار تھے۔ اولوالامر کو قانون میں کسی ترمیم یا اختراع کا اختیار نہ تھا صرف اس قدر اختیار تھا کہ جس معاملہ میں وہ کتاب و سنت کی کوئی واضح بات نہ پائیں اس معاملہ میں جمع ہو کر اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت سے اوفق بات ڈھونڈھ کر اس پر نظام امت کو چلائیں۔ اس کی ان کو "واعتصموا بحبل اللہ" والی آیت میں تعلیم دی گئی تھی اور جماعت اور جماعتی زندگی کا یہی طریقہ ان کو سورہ نساء کی مشہور آیت میں بتایا گیا تھا۔

یاایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ	اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور
واطیعوا الرسول واولی الامر	رسول کی اطاعت کرو اور اولوالامر کی اطاعت
منکم فان تنازعتم فی شیٔ	کرو پس اگر کسی معاملہ میں تم مختلف الرائے ہو
فردوہ الی اللہ والرسول	تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ

اس آیت کے سمجھنے میں لوگوں سے سخت کوتاہیاں ہوئی ہیں لیکن اس وقت اس پر مفصل بحث کا موقع نہیں ہے۔ اس کے صرف ایک لطیفہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ اس میں جن کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے وہ تین ہیں۔ اللہ، رسول، اولوالامر۔ اور ظاہر ہے کہ امت کی تشکیل اسی طرح ممکن تھی لیکن تنازع کے وقت رجوع کا حکم صرف اللہ و رسول کی طرف دیا گیا ہے۔ اولوالامر کو اس سے الگ کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ بالاجمال یہ ہے کہ تنازع سے مراد یہ ہے کہ کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس میں قرآن یا سنت کی کوئی نص صریح موجود نہ ہو اور اس میں کسی کی رائے کچھ ہو کسی کی کچھ تو ایسے معاملہ میں امت بواسطہ اولوالامر ان کلیات و اصول کی طرف رجوع کرے گی جو کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں اور اس سے استنباط کر کے کوئی

اوفی حکم حاصل کرے گی۔ کتاب و سنت قانون ہیں، اولوالامر قانون کی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس لئے رجوع کے مراکز میں وہ شامل نہیں ہیں، وہ اس رجوع میں عام امت کے ساتھ خود شریک ہیں بلکہ امت کے دماغ کی حیثیت سے وہی رجوع کریں گے۔ یہ اس لئے فرمایا کہ قانون کی حاکمیت بلا اقتسام محفوظ رہے۔ ان الحکم الا للہ

ہم نے یہ جو کچھ لکھا ہے قتل عثمانؓ سے پہلے امت کا طریقہ یہی تھا چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ ازالۃ الخفا میں اس دور کی نسبت فرماتے ہیں۔

"وعظ و فتویٰ موقوف بود برائے خلیفہ بدون امر خلیفہ وعظ نمی گفتند و فتوی نمی دادند و اخیرا بغیر توقف برائے خلیفہ وعظ می گفتند و فتوی دادند و دریں وقت مشاورۃ جماعت در فتویٰ موقوف ماند . . . .

تحقیق آنست کہ تا زمان حضرت عثمان اختلاف مسائل فقہیہ واقع نمی شد در محل اختلاف بخلیفہ رجوع می کردند و خلیفہ بعد مشاورت امرے اختیار می کرد و ہماں امر مجمع علیہ می شد و بعد وجود فتنہ ہر عالمے برائے خود فتویٰ می داد و دریں زمانہ اختلاف واقع شد و آنچہ شہرستانی در کتاب ملل و نحل گفتہ کہ بمجرد وفات آنحضرت صلعم اختلاف پدید آمد خطا است۔ اختلاف آن نیست کہ در اثنائے مشاورت اقوال متغائرہ گویند و بآخر امرے منقح شود و برہماں امر اجماع کنند اختلاف آن است کہ ہر دو قول مستقر پیدا شود و ہر یکے بجانب خود دہرم وضع مخالف خواہد . . . . ومفسدہ عظیمہ کہ بر آن مترتب گشت آنست کہ طبقات متاخرین ایں تغیر را بہیئتہا و صفاتہا سنت خیال کردند ازیں جہت کہ اصل او ماخوذ از سنت بود ولائمہ قائم نمودند بر تارک آں یا مقصر در آں"

(باقی)

مقالات

تبلیغ اور پروپگنڈا

(۲)

از جناب مولوی حافظ عبدالاحد صاحب اصلاحی

دونوں کے مخاطب اور ان کا اثر

تبلیغ ہمیشہ انسان کی عقل، اس کی فطرت سلیم اور اس کے نفس ناطقہ کو مخاطب کرتی ہے لیکن پروپگنڈا کبھی عقل کو مخاطب نہیں کرتا۔ وہ عقل سے ہمیشہ کترا کر نکل جانا چاہتا ہے اور اپنا جادو انسان کے نفس اور اس کی شہوات پر چلاتا ہے وہ عوام کے دلوں کی کسی محبوب خواہش کو ڈھونڈھ لیتا ہے اور پھر اسی کے سہارے ساری قوم کے حواس و مشاعر پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد بڑے بڑے حکما اور عقلا، اس کے سحر سے مسحور و اس کے شعبدہ سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو چیز انسان کے اندر عقل کے راستے نہیں آئے گی وہ زیادہ دیر تک قرار نہیں پکڑ سکتی۔ وہ جس سرعت کے ساتھ پھیلتی ہے اسی سرعت کے ساتھ اس کے فنا ہونے کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔

مثل كلمة خبيثة كشجرة	گندی بات کی مثال گندے درخت کی سی ہے کہ
خبيثة ن اجتثت من فوق	جس کو زمین کے اوپر سے جب چاہا اکھاڑ لیا
الارض ما لها من قرار	اور اس کو کوئی ثبات نہیں ہے۔

اس کی بہترین مثال فرانس کے انقلابات میں مل سکتی ہے۔ روسو نے، جمہور کی آزادی کا جو صور پھونکا اس نے سارے ملک کو مدہوش کر دیا۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے فلسفی اور حکیم بھی اس کے نظریات اور دلائل کی کمزوریوں پر غور نہیں کر سکتے تھے لیکن جب روسو کی لائی ہوئی آندھی عمارتوں کو مسمار، باغوں کو ویران، بستیوں کو اجاڑ کر کے گذر گئی اور لوگوں کو بعد کے نتائج پر غور کرنے کی فرصت ملی تو بہتوں کو اپنی رائیں بدلنی پڑیں اور انھیں نظر آیا کہ روسو کے نظریات اتنے پر زور نہیں تھے جتنا اس کے حامیوں کا پروپگنڈا پر زور تھا اور یہ نتیجے میں بہت کچھ مدد ان نتائج نے دی جو فرانس میں ظاہر ہوئے۔

جنگ عظیم کے دوران میں مغربی قوموں نے ایک دوسرے کے خلاف جو طوفانی پروپگنڈے کیے اس نے ہمیشہ کے لیے انھیں ایک دوسرے سے بدظن کر دیا اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی اخلاقی عظمت کا جو اعتراف تھا وہ اعتراف انکار سے بدل گیا نیز ترکوں کے خلاف عربی ممالک میں آزاد عرب سلطنت کے قیام کے پردہ میں جو ناروا پروپگنڈا انگریزوں کی طرف سے کیا گیا جس کے نتیجے کے طور پر عرب ترکوں کے خلاف انگریزوں کے ہمنوا بن گئے تھے۔ اس کا انجام کیا ہوا؟ یہ ہوا کہ اصل حقیقت جب عربوں کی نگاہوں کے سامنے آگئی، انھیں یقین ہو گیا کہ آزاد عرب سلطنت کے قیام کا جو سبز باغ دکھلایا گیا تھا وہ محض سراب تھا اس احساس کے پیدا ہو جانے کے بعد انگریزی قوم کی جو اخلاقی عظمت ان کے دلوں میں تھی وہ باقی نہیں رہی بلکہ الٹے انگریزوں کے عمل سے نفرت پیدا ہو گئی۔ یہی حال اس پروپگنڈا کا بھی ہوا جو ترکوں کے ارتداد کے متعلق سارے عالم اسلامی میں زور شور سے جاری کیا گیا تھا۔ پہلے تو اس چیز سے عالم اسلامی میں ایک عام منافرت اور بیزاری کا جذبہ ترکوں کے خلاف پیدا ہوا مگر جب کچھ دنوں کے بعد حقیقت حال سے پردہ ہٹا تو ترکوں سے قدرۃً ہمدردی اور پروپگنڈا کرنے والی قوموں سے

نفرت پیدا ہو گئی

اس کے بالکل برعکس تبلیغ ہمیشہ عقل کو مطمئن اور آسودہ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے کام طمع، خوف، اور رغبت سے بالکل خالی ہوتے ہیں۔ اس کی نظر اپنے کاموں کے نتائج کی مقدار سے زیادہ اس کی کیفیت پر ہوتی ہے۔ ایک پروپیگنڈسٹ جس طرح بھی اپنی جماعت میں ایک فرد کا اضافہ کرلے اس پر خوش ہوتا ہے اور اس کو اپنی بڑی کامیابی سمجھتا ہے کیونکہ وہ توقع رکھتا ہے کہ کسی موقع پر جیب کا یہ کھوٹا سکہ بھی کام دے سکتا ہے۔ مگر مبلغ کھوٹے سکہ کو کوڑی کے برابر بھی وقعت نہیں دیتا۔ اس کی کوششوں کا چاہے کچھ نتیجہ نہ ہو مگر وہ اپنے عمل کی تقدیس کو برباد نہیں کر سکتا۔

اس زمانہ میں عیسائی مشنریوں کے جو رسالے نکلتے ہیں، ان پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کے حواریین کے یہ جانشین دنیا کے نقشہ میں سے کس کس طرح پہلے ان مقامات کو تلاش کرتے ہیں جہاں ان کی انگلی دھنس سکتی ہے، اور پھر کمزوروں، بھوکوں، بے نواؤں کو ورغلانے کیلئے کیا کیا داؤ پیچ کھیلتے ہیں اور کن کن حیلوں اور چالوں سے ان کو اپنے دام فریب میں پھنساتے ہیں۔

مگر تبلیغ کا بنیادی اصول یہ ہے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ	اپنے رب کے راستہ کی طرف بلاؤ حکمت
وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْہُمْ	اور موعظۂ حسنہ سے اور ان سے اس طریقہ
بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَن	سے مجادلہ کرو جو بہترین ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ طریق جھوٹ، فریب، طمع، اور ترغیب کا نہیں ہو سکتا۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی دعوت کا مخاطب ان لوگوں کو بناؤ جو ارباب عقل و استعداد

ہیں نہ کہ عوام کو جو بیچارے کسی چیز کے حسن و قبح کو مشکل سے معلوم کر سکتے ہیں اور آسانی سے طمع و ترغیب اور جذبات کے شکار ہو جاتے ہیں۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ نے تفسیر سورہ لہب میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں[۱] "حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زجر و توبیخ کے سب سے پہلے ہدف علماء یہود ہوئے کیونکہ امانت الٰہی کے حامل ہونے کی وجہ سے سب سے پہلے بازپرس کے مستحق وہی تھے۔ علماء علم کے امام ہوتے ہیں اس لئے ہدایت و اصلاح کی دعوت سب سے پہلے انہی کو مخاطب کرتی ہے کہ ان کی اصلاح عوام کی اصلاح کا ذریعہ ہو۔ اگر انبیاء کرام علیہم السلام اپنی دعوت میں رہبران قوم سے اغماض کر جاتے تو یہ دین کے معاملہ میں ناجائز چشم پوشی ہوتی اور دعوت حق کا تمام کاروبار درہم برہم ہو جاتا۔ یہ طریق دعوت باغیوں اور طالبین ملک و دولت کا ہے جو ہمیشہ عوام کو ورغلا کر اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی مقام انبیاء کرام اور طالبین ملک و جاہ کے درمیان نقطہ امتیاز ہے جہاں سے دونوں جماعتوں کی راہیں الگ ہو جاتی ہیں۔

دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا نے حکم دیا کہ سب سے پہلے فرعون کو مخاطب کریں۔ فرمایا

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ	فرعون کے پاس جاؤ اس نے سرکشی کی اور کہو
طَغٰى فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى	کیا میں تجھے تلقین کروں کہ تو پاکی حاصل کرے
وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى	اور تیرے رب کی راہ سوجھاؤں کہ تو اس سے ڈرے

حضرت دانیال علیہ السلام نے اپنے وقت کے شہنشاہ اعظم بخت نصر کو دعوت دی" یرمیاہ نبی نے شمال کے بادشاہوں پر نبوت کی اور حضرت خاتم النبیینؐ نے متعدد سلاطین عالم کو نامے لکھے"۔

موجودہ پروپگنڈے کا ایک کارگر ہتھیار یہ بھی ہے کہ جس جماعت کے خلاف پروپگنڈا کرنا ہو اس کی تحقیر و تذلیل کی جائے تاکہ اس کی اور اس کے اصولوں کی وقعت دلوں میں کم ہو لیکن تبلیغ

---

[۱] تفسیر سورہ لہب اردو ترجمہ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

کے اصولوں میں ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ

وَقُلْ لِعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ
اَحْسَنُ. اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ
بَیْنَهُمْ. اِنَّ الشَّیْطَانَ کَانَ
لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا. رَبُّکُمْ
اَعْلَمُ بِکُمْ اِنْ یَّشَاْ یَرْحَمْکُمْ
اَوْ اِنْ یَّشَاْ یُعَذِّبْکُمْ وَمَا اَرْسَلْنٰکَ
عَلَیْهِمْ وَکِیْلًا. وَرَبُّکَ اَعْلَمُ
بِمَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَقَدْ
فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعْضٍ
وَّاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا

اور کہو میرے بندوں سے کہ وہ بات کہیں جو بہترین ہے کیونکہ شیطان فساد ڈلواتا ہے بیچ شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے، تمھارا رب تم کو خوب جانتا ہے اگر وہ چاہے گا رحم کرے گا اور اگر چاہے گا عذاب دیگا اور ہم نے تم کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا ہے اور تیرا رب خوب جانتا ہے ان کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی ہے اور داؤد کو ہم نے زبور دی۔

اس آیت نے وہ تمام اصول بیان کر دیئے جو ایک مبلغ کے پیش نظر ہونے چاہئیں۔ یعنی اس کو ہمیشہ بہترین اسلوب سے اپنا مقصد پیش کرنا چاہیے۔ شیطان کے فریب میں آکر دوسروں کی ہجو و تحقیر کر کے ان کے دلوں کو خراب نہ کرنا چاہیے، اور نہ کبھی دوسروں کے پیشواؤں کی تحقیر اور اپنے پیشواؤں کی تحقیر کو ذریعہ کامیابی بنانا چاہیے کہ یہ راہ تبلیغ کی راہ نہیں ہے۔ فتنہ کی راہ ہے۔

حکمتِ غرب

مارکس اریلیس کے خیالات

از جناب مولوی نیاز احمد صاحب صدیقی ایم اے

اگر تو اپنے ہر عمل کو اصول فلسفہ کے قالب میں نہیں ڈھال سکتا تو متکدر، متنغص، کوفت اور ناامیدی سے مغلوب نہ ہو۔ جب ایک امید کا خاتمہ ہو جائے تو پھر مشغول مجادلہ ہو جا۔ اگر تیرے بیشتر کام انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہیں تو تجھے بالکل مطمئن ہو جانا چاہئے۔ جیسے عاشق محبوب کی طرف ہمہ شوق تیز گام ہوتا ہے اسی طرح تو بھی قدم بڑھائے جا۔ فلسفہ کو خوفناک معلم نہ سمجھ، بلکہ تو اس کی طرف اسی طرح متوجہ ہو جیسے آشوب چشم کا مریض اسپنج اور انڈے کی طرف یا دوسرا مریض ضماد لگانے اور چھینکنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ فطرت کی ایسی فرمانبرداری سے تجھکو کسی درد کی مزید کسک نہ محسوس ہوگی بلکہ تجھکو طمانیت اور سکون قلب حاصل ہوگا۔ اس بات کو یاد رکھ کہ منشاء فلسفہ اور تیری فطرت کے منشاء میں کوئی تضاد نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہو تو تجھکو سمجھنا چاہئے کہ تیری ہی ایک ایسی خواہش ہے جس کو فطرت منع کرتی ہے، فطرت کی اس ممانعت سے تو مذبذب ہو جاتا ہے لیکن اپنی خواہش کی غایت دلکشی کا بھی تو قائل ہوتا ہے۔ لیکن کیا یہ تعیش کا صرف دلچسپ مغالطہ نہیں ہے؟ دیکھ اور غور کر کہ کیا تحمل، آزادی، سادگی، رحم، پاکی میں اس سے زیادہ دلکشی نہیں ہے، کیا عقل سے زیادہ کسی اور چیز میں پرسحر دلکشی ہے جبکہ ایک آدمی یوں غور کر سکتا ہے کہ اس کی فہم و ادراک ہی مکمل استقلال

اور بے روک ترقی کے حامل ہیں ۔

"کس مقصد کے لیے میں اپنی روح استعمال کر رہا ہوں؛ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کو ہر گھنٹہ اپنی ہی ذات سے کرنا میرا فرض ہے۔ مزید دریافت طلب امر یہ ہے کہ میری وہ چیز جسکو "کار فرما اصول" کہتے ہیں اس وقت کن اجزا پر مشتمل ہے؟ میری روح جیسا کہ وہ اسوقت ہے صحیح طور پر کس کی روح کے مانند ہے؟ اس کا خیال رکھ کر وہ بچہ کی روح نہ ثابت ہو، وہ طفلانہ، زنانہ، ظالمانہ روح نہ ہو، وہ ایک بیل یا چیتا کی روح نہ ہو۔

"جیسے تیرے خیالات ہوتے ہیں ویسا ہی تیرا دماغ بھی ہوگا کیونکہ خیالات کی عکس ریزی روح قبول کرتی ہے پس روح کو ان خیالات کی یکرنگی سے تو گہرا رنگ دے۔ جہاں زندگی ممکن ہے وہاں نیک زندگی ممکن ہے پس جہاں زندگی کا وجود ممکن ہے وہاں نیکی کا بھی وجود ممکن ہے۔ اور جس مقصد کے لیے بھی جو چیز بنائی گئی ہے اسی مقصد کی طرف وہ چیز رخ کرتی ہے اور جس طرف بھی وہ جاتی ہے وہیں اس کا مستقر ہوتا ہے، جہاں مستقر ہوتا ہے وہیں اس کی سودمندی، منفعت بخشی، اور مکمل سودمندی کا سرچشمہ ہوتا ہے" پس عقلی زندگی کی سودمندی کا مقصود جماعت ہے کیونکہ جیسا ہم نے اوپر بیان کیا ہے جماعت ہی ہماری زندگی کا مقصود ہے۔ یہ بات خوب واضح کر دی گئی ہے کہ ادنیٰ کے وجود کی غرض و غایت اعلیٰ کی خدمت اور اعلیٰ کے وجود کا مقصد باہم ایک دوسرے کی خدمت کرنا ہے۔ ذی حیات، جمادات سے اور حامل عقل، ذی حیات سے برتر ہیں۔

شے ناممکن الحصول کا تعاقب دیوانگی ہے۔ بدوں کیلئے اپنی بدی کے خلاف عمل پیرا ہونا ایک ناممکن بات ہے۔

بجز اس افتاد کے جو ایک شخص خود فطرتاً برداشت کر سکتا ہے کسی پر کوئی افتاد نہیں پڑتی۔ وہی افتاد کسی اوپر پڑ سکتی ہے اور ممکن ہے کہ صرف اسکی افتاد سے لاعلمی یا مرد میدان بننے کی خواہش اس کو قوی اور ہزیمت سے غیر متاثر رکھے۔ تو ایسی صورت میں کیا یہ بات قابل انگیز ہے کہ جہالت اور نمود و نمائش اپنے کو عقل سے قوی تر ثابت کریں۔

بذات خود چیزیں روح سے کوئی بھی ربط و واسطہ نہیں رکھتی ہیں۔ چیزونکو کوئی اندرونی رسائی بھی حاصل نہیں، روح کی تبدیلیوں اور حرکت پر ان کو کوئی قابو نہیں کیونکہ روح خود بخود تبدیل و متحرک ہوتی ہے اور روح جو بھی فیصلہ مناسب سمجھتی ہے اسی کے مطابق یہ (روح) ان تمام چیزوں کو ڈھال دیتی ہے جو باہر سے اندر آنے کا مطالبہ کرتی ہیں۔

ایک نقطۂ نظر سے انسان ہمارے لئے عزیز اور محبوب ترین شے ہے یعنی جس حد تک ہمارے لئے یہ شایان شان ہے کہ ہم بنی نوع انسان کی بھلائی اور اسکی غمگساری کریں لیکن جب بھی انسان میرے فرائض کے راستہ میں سنگ راہ ہونے لگتا ہے تو اسوقت انسان میرے لئے ویسا ہی ہو جاتا ہے جیسے اور بہت سی چیزیں ہیں جن سے نہ مجھے محبت ہے نہ نفرت وہ اسی زمرہ میں آجاتا ہے جیسے سورج یا ہوا، یا بہائم ہیں جو فنا ہو جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ لوگ کہیں کہیں میری جدوجہد میں مخل ہو سکتے ہیں لیکن میری تحریکات طبعی اور میری طبیعت ہر رخنہ اندازی کے دسترس سے محفوظ ہیں کیونکہ حالات کے مطابق عمل اور تبدیلی کی قوت ان میں ودیعت کی گئی ہے کیونکہ دماغ یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ ہر رخنہ کو جو اس کی سرگرمی میں مخل ہو اس میں مکانی و ذاتی تبدیلی کر کے اس کو اپنی جد و جہد میں امداد کا وسیلہ بنا لے پس راہ عمل کی ہر رکاوٹ حلیف بنجاتی ہے اور اس راستہ کا ہر سنگ گراں شمع راہ بنکر آگے کی منزل کی رہنمائی کرتا ہے

کتب خانہ

تقریظ وتبصرہ

تنقیحات ۔ مولفہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ ضخامت ۲۴۰ صفحے کتابت نہایت خوشخط، طباعت عمدہ، کاغذ سفید گلیز، قیمت غیر مجلد ۲؍ محصولڈاک ۴؍

پتہ:۔ دفتر ترجمان القرآن، ملتان روڈ، لاہور۔

پچھلے چند برسوں میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے رسالہ ترجمان القرآن میں اسلام اور مغربی تہذیب کے باہمی تصادم سے پیداشدہ مسائل پر بعض عمدہ تنقیدی مقالات لکھے ہیں۔ اب وہی مضامین ادارہ دارالاسلام نے "تنقیحات" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کردیے ہیں۔ یہ مضامین تعداد میں بیس ہیں۔ ان میں مغربی تعلیم وتمدن کے اثرات اور ان کی پیداکردہ غلط فہمیوں پر نہایت عالمانہ تنقید کی گئی ہے۔ ہمارے نئے تعلیم یافتہ نوجوان جو مذہب کا مطالعہ کئے بغیر محض سنی سنائی باتوں کی وجہ سے دھوکے میں آگئے ہیں وہ ان مضامین کو پڑھیں اگر اللہ تعالیٰ کو ان کی بہتری منظور ہوگی تو اس سے ان کے دلوں کے بہت سے شبہے دور ہوجائیں گے۔ ساتھ ہی ہم عربی مدارس کے نئے فارغین کو بھی ان مضامین کے مطالعہ کا مشورہ دیتے ہیں اس سے ان میں مذہبی مسائل پر فکرونظر کا سلیقہ پیدا ہوگا۔ حالات کے اثر سے عربی مدارس کے نئے فارغین میں کچھ رواداری اور روشن خیالی تو پیدا ہوچلی ہے لیکن نئے طریقۂ فکرو نظر سے ناآشنائی کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ آزادی، بے قیدی اور مطلق العنانی کی صورت نہ

اختیار کرلے ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ مصنف کی ان خدمات میں روز افزوں اضافہ ہو اور ان چیزوں کو پڑھنے والے اور ان کو مسلمانوں میں پھیلانے والے پیدا ہوں۔

مصنف کے سیاسی نظریات سے ہم کو جو اختلاف ہے وہ سب کو معلوم ہے اسلئے ان سے تعرض کی ضرورت نہیں۔

رسالہ دینیات ۔ مولفہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ تقطیع ۱۸×۲۲/۸ حجم ۱۳۶ صفحے، کتابت و طباعت بہتر، کاغذ سفید گلیز قیمت ۱ر محصولڈاک ۲ر پتہ:۔ دفتر ترجمان القرآن، ملتان روڈ، لاہور۔

عرصہ ہوا مولانا مودودی نے دکن کے بعض علماء کے مشورہ سے یہ رسالہ بالکل سادہ انداز پر ہائی اسکولوں کی آخری جماعتوں اور کالجوں کی ابتدائی کلاسوں کیلئے لکھا تھا جسے حیدر آباد کے محکمہ تعلیمات نے شریک نصاب کر لیا ہے۔ اس پر الاصلاح کی کسی گذشتہ اشاعت میں تفصیلی تبصرہ ہو چکا ہے۔ یہ اسی رسالہ کا دوسرا اڈیشن بعض ضروری اضافوں اور ترمیمات کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اب پہلے سے اس کی افادی حیثیت بڑھ گئی ہے۔ امید ہے مسلمان اس کی قدر کریں گے۔ اسلامی اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں داخل کرکے اس کے فائدہ کو عام کریں گے۔

تفسیر بالرائے ۔ مؤلفہ مولانا ثناء اللہ امرتسری۔ تقطیع ۱۸×۲۲/۸ حجم ۱۱۲ صفحے، کتابت و طباعت متوسط کاغذ سفید قیمت:۔ ۱ر محصولڈاک ۲ر پتہ:۔ دفتر اہل حدیث۔ امرتسر (پنجاب)

اس کتاب میں ابتداءً تفسیر بالرائے کے معنی و مفہوم کی تشریح کی گئی ہے، اس کے بعد بقول مصنف مروجہ اردو تفسیروں میں سے ان تمام تفسیروں کی اصلاح کی گئی ہے جو تفسیر بالرائے کی مصداق ہیں۔ مصنف نے خصوصیت کے ساتھ مرزا غلام احمد قادیانی، مولوی مقبول احمد شیعی، مولوی عبداللہ چکڑالوی، مولوی محمد علی لاہوری، مولوی احمدالدین امرتسری، مرزا محمود احمد خلیفہ قادیان، شیخ بہاء اللہ ایرانی، خواجہ حسن نظامی کی تفسیروں کو سامنے رکھا ہے اور ہر ایک کی غلطیاں الگ الگ واضح کی ہیں اور اس طرح یہ کتاب سورۂ فاتحہ سے شروع ہو کر سورۂ بقرہ پر تمام ہوتی ہے۔ اور شاہ

اسی انداز پر مصنف پورے قرآن مجید کی تفسیر لکھ ڈالیں۔ مصنف کو رد و جواب اور بحث و مناظرہ میں جو ید طولیٰ حاصل ہے اس کی شہادت اس کتاب کے ہر صفحہ میں موجود ہے۔ جو لوگ اس طرح کی چیزوں سے ذوق رکھتے ہیں وہ امید ہے اس سے فائدہ اٹھائیں گے:۔

ہندوستان کی صنعت او تجارت ۔ مصنفہ مولانا منت اللہ رحمانی۔ ایم، ال، اے (بہار) تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۲۱۲ صفحے ۔ کتابت، طباعت، کاغذ عمدہ قیمت مرقوم نہیں۔ پتہ: مکتبہ سیفیہ، مونگیر (بہار)

اس کتاب میں ہندوستان کی صنعت و تجارت کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور یہ دکھلایا گیا ہے کہ عہد قدیم میں ہندوستانی صنعت و تجارت کا کیا حال تھا اور کن کن ممالک کے ساتھ ہندوستان کے تجارتی تعلقات تھے۔ اور یہاں کی مصنوعات اور خام مال کی کن کن ملکوں میں کھپت تھی۔ مسلمان جب آئے تو انھوں نے اپنے دوران قیام اور زمانہ حکومت میں ہندوستانی صنعت و حرفت میں کتنا حصہ لیا اور کیا کیا تغیرات پیدا کئے ۔ ان کی کوششوں سے یہاں کی صنعت و حرفت اور تجارت کو کتنا فروغ ہوا۔ اور دوسرے ممالک میں یہاں کی مصنوعات کی کس قدر مانگ بڑھی۔ انگریز جب تک ہندوستان میں نہیں آئے تھے تو یہاں کی پارچہ بافی، جہاز سازی، لوہا، رنگ، تیل، عطر، ہاتھی دانت، اور پتھر کی مصنوعات، نیز خام مال کی تجارت کی ترقی کے کیا اسباب و وجوہ تھے۔ پھر جب انگریزوں کا قدم ہندوستان میں پہنچا اور یورپ کے مختلف ممالک کی کمپنیاں آنا شروع ہوئیں تو انھوں نے ہندوستانی صناعوں اور مصنوعات کی برآمد کی راہ میں کیا کیا کانٹے بوئے، ان کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوئی تو اس نے ہندوستانی صنعت و حرفت اور کچے مال کی تجارت کو کس طرح برباد کیا۔ اور یہاں کے کاریگروں پر کیسے کیسے دردناک مظالم توڑے۔ پھر جب ایسٹ انڈیا کمپنی موجودہ حکومت میں تبدیل ہوگئی تو اس حکومت نے ہندوستانی اشیاء کی برآمد پر کتنا زبردست محصول عائد کیا۔ اور دوسرے ممالک

بالخصوص انگلستان میں یہاں کے کپڑوں وغیرہ کی کس طرح ممانعت کردی۔ یہاں کی صنعت جہاز سازی کچے مال کی تجارت اور دیگر قسم کی مصنوعات کو کن کن حیلوں سے تباہ کیا اور ہندوستان کو لوٹ کر انگلینڈ کی صنعتی حیثیت کو کس قدر ترقی دی۔ اس تمام سرگذشت کے بعد مصنف نے نہایت قوی دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کی صنعت و تجارت کی تباہی کی ذمہ داری صرف انگریزوں پر ہے

گو یہ کتاب دو سو سے زائد صفحات پر پھیلی ہوئی ہے لیکن موضوع کی اہمیت اور وسعت کے لحاظ سے ابھی بہت تشنہ اور مختصر ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ملک نے اس کتاب کی قدر کی تو مصنف دوسرے اڈیشن میں اس کو اس سے زیادہ مکمل اور بہتر صورت میں پیش کریں گے۔ اس میں بنگال و بہار کی صنعتوں کا تذکرہ جتنا زیادہ ہے دوسرے صوبوں کی صنعتوں کا اتنا ہی کم اور بعض کا صفر کے برابر ہے۔ دوسرے مورخین و مصنفین کے جو اقوال اس میں درج ہیں ان کو اگر کتابوں اور ان کے صفحات کی قید کے ساتھ درج کیا جاتا تو وہ زیادہ بھروسہ کے قابل ہوتے۔ البتہ یہ خوب بات ہوئی ہے کہ یورپی مصنفین اور اشخاص کے نام ان کے اصل انگریزی حروف میں بھی لکھے ہوئے ہیں۔ جو لوگ سیاسی حالات و واقعات سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے یہ ایک عمدہ چیز ہے جس سے ان کی معلومات میں اضافہ بھی ہوگا اور عند الضرورت وہ اس سے استشہاد بھی کر سکیں گے۔

دنیا کی کہانی ۔ مصنفہ پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن)، تقطیع $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$ حجم ۲۲۶ صفحات، کتابت و طباعت صاف ستھری۔ کاغذ سفید گلیز۔ قیمت دو ۲ روپے ؍ع
پتہ: ۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔ لاہور، لکھنؤ۔

یہ مصنف کی ان چند تقریروں کا مجموعہ ہے جو آل انڈیا ریڈیو کی فرمائش پر تیار کی گئی

تھیں۔ اب انہی کو ریڈیو ڈائرکٹر کی اجازت سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ اس میں آفرینش دنیا سے لیکر آج تک کی تاریخ کا نہایت عمدہ خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ پہلے دنیا کی پیدائش کے علمی اور سائنٹفک وجوہ و اسباب بتائے گئے ہیں۔ پھر دنیا کی ابتدائی تہذیب اور مشرق و مغرب کی تمام قدیم مشہور تہذیبوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ قدیم یونان و روما، ہندوستان و چین کی تہذیب، ایرانی تمدن، عیسائی مذہب، اسلام اور مسلمانوں کی سیاست، اسلامی تہذیب کے اصول و مبادی اور طور طریقے، بڑی خوبی سے بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد ترک و تاتار کے حملوں کے واقعات، مسلمانوں کے اختلاط سے پیدا شدہ ہندوستانی تہذیب، یورپ کی ابتدائی تہذیب، موجودہ یورپین سیاست، موجودہ مغربی تہذیب، اور حالات حاضرہ کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ یہی حالات اور کتابوں میں بھی بیان کئے گئے ہیں لیکن اکثر روکھے پھیکے انداز میں کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کے مطالعہ سے جی اچاٹ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ کتاب میر باقر کی داستان سے زیادہ پر لطف معلوم ہوتی ہے۔ پڑھتے چلے جائیے مگر سیری نہیں ہوتی۔ زبان بھی نہایت پیاری اور صاف ستھری ہے

رسول پاک - مولفہ مولوی عبدالواحد سندھی جامعی استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ، تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ ضخامت ۱۲۵ صفحے۔ کتابت و طباعت نہایت روشن، کاغذ سفید قیمت ۸ آٹھ آنے

پتہ:۔ مکتبہ جامعہ دہلی، لاہور، لکھنؤ۔

یہ کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے اس میں سرور کونین صلعم کی سیرت پاک کو بیان کیا گیا ہے۔ رسول پاک کون تھے؟ رسول پاک کیسے تھے؟ رسول پاک نے کیا سکھایا؟ اس کتاب کے یہ تین جلی عنوانات ہیں۔ ہر ایک عنوان کے تحت بہت سی ذیلی سرخیاں

ہیں، جس میں آنحضرت صلعم کی حیات طیبہ کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ زبان نہایت پیاری اور انداز بیان اتنا دلنشین ہے کہ بچے اس کے پڑھنے اور سمجھنے میں کوئی الجھن نہ محسوس کریں گے۔ بچوں کے مطالعہ کے لئے نہایت عمدہ کتاب ہے۔

محکومیت نسواں ۔ مصنفہ جان اسٹوارٹ مل۔ ترجمہ مولوی معین الدین انصاری بی۔ اے (کنٹیب) ایم، آر، اے، ایس (لندن) بیرسٹرایٹ لا تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ حجم ۱۲۳ صفحے کتابت وطباعت بہتر، کاغذ نفیس۔ جلد مضبوط، گرد پوش خوبصورت۔ قیمت ایک روپیہ

پتہ:۔ مکتبہ پنجاب ۔ لاہور۔

یہ مل کی مشہور تصنیف (*The subjection of women.*) کا ترجمہ ہے۔ اس میں عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیئے جانے کی پرزور حمایت کی گئی ہے۔ اور عورتوں کو ذہنی وفکری صلاحیت، علمی وسیاسی قابلیت، اور فوجی وانتظامی استعداد میں مردوں کے ہم پلہ ثابت کیا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ ہر زمانہ، ہر تمدن، ہر حکومت جملہ مذاہب، اور دنیا کے تمام سماجی نظاموں میں عورتوں کے حقوق کے ساتھ بڑی ناانصافی برتی گئی ہے اور انھیں دنیا کے سماج میں ایک خادمہ سے زیادہ کبھی رتبہ نہیں دیا گیا۔ ضرورت ہے کہ یہ ناانصافیاں دور ہوں اور عورتوں کو جملہ امور دنیا میں مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ مصنف کا انداز بیان نہایت پرجوش اور موثر ہے۔ یورپ کے طبقہ نسواں کی موجودہ بے قیدی، اسی قسم کے موثر پروپگنڈے کا نتیجہ ہے۔ عورتوں کے حقوق کے ساتھ ناانصافی اور ظلم کی اس داستان میں مصنف نے اسلام کے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے۔ حالانکہ دنیا کے تمام مذاہب میں سب سے زیادہ عورتوں کے حقوق اور ان کی سماجی رفعت کی طرف جس مذہب نے توجہ کی وہ مذہب اسلام ہی ہے۔ گو مترجم نے اسے مصنف

کی ناواقفیت اور تاریخ اسلام سے بے خبری پر محمول کیا ہے لیکن ہمارے خیال میں یہ تعصب کی ایک بدترین مثال ہے۔ کیونکہ عیسائیت کے متعلق اس کے یہ خیالات نہیں ہیں۔ عیسائیت کی پاسداری کتاب میں جگہ جگہ نمایاں ہے۔

اس کتاب کا ترجمہ بہت اچھا ہوا ہے۔ مگر فی نفسہٖ کتاب میں کوئی خاص بات نہیں ہے اُن کے دلائل نہایت سطحی اور اوچھے ہیں۔

اجتماعی زندگی کی ابتدا ۔ مصنفہ پروفیسر محمد عاقل۔ ایم۔ اے۔ استاد معاشیات جامعہ ملیہ تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ حجم ۱۱۲ صفحے کتابت و طباعت بہتر۔ کاغذ سفید۔ قیمت آٹھ آنے۔

پتہ:۔ مکتبہ جامعہ دہلی - لاہور لکھنؤ۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے انسان کی اجتماعی زندگی کے بالکل ابتدائی حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں انسان کے آغاز اور اس کی ابتدائی نشو و نما کو جدید نظریہ ارتقاء اور اثری تحقیقات کی روشنی میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ شروع شروع میں انسان کے رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، ہنسنے بولنے، اور کھانے پینے کے کیا انداز تھے۔ اور اس کے اندر اجتماعی شعور نے کب سے جنم لیا۔ اس کے بڑھنے اور پھیلنے کے کیا وجوہ و اسباب ہوئے اور اس شعور نے انسان کی معاشی احتیاجات میں کتنا دخل پایا۔ معاشی احتیاجات کے پورا کرنے کے لئے تجارت، کاشت، صنعت، اور دوسرے معیشت کے اسباب کیسے پیدا ہوئے۔ اور ان اسباب نے انسانی زندگی کے اندر کتنی تبدیلیاں پیدا کیں، آبادیاں اور شہر کب بسے۔ بڑے گے خاندان اور قبائل کیسے وجود میں آئے اور ان کے وجود میں آنے کے بعد انسان کے اندر کیا تہذیبی تغیرات ہوئے۔ غرض یہ تمام باتیں انسان کی اجتماعی زندگی کے بالکل ابتدائی مراحل سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے اس کتاب کو بھی اردو میں اجتماعیات کی پہلی ہی کتاب سمجھنا چاہئے۔

امید ہے صاحب کتاب ہندوستانی زبان کی تہی دامنی کا خیال کرتے ہوئے آئندہ بھی اس موضوع پر لکھتے رہیں گے۔

ادب لطیف ڈرامہ نمبر۔ مرتبہ جناب چودھری برکت علی بی اے وجناب مرزا ادیب بی اے تقطیع ۲۲×۳۰ صفحات ۲۲۲ صفحے کتابت وطباعت بہتر، کاغذ سفید چکنا قیمت ڈرامہ نمبر ۱۲؍ قیمت سالانہ مع سالنامہ وغیرہ ہے۔ پتہ:- مکتبۂ اردو، لاہور۔

ڈرامہ بحیثیت فن، دنیائے ادب کا نہایت مفید اور ترقی یافتہ شعبہ ہے۔ موجودہ عہد کے ذہنی اور سیاسی انقلابات میں اسے بہت کچھ دخل ہے۔ اردو میں اس شعبہ کی اب تک جو کچھ خدمت کی گئی ہے وہ بالکل تفریحی اور ابتدائی ہے۔ لے دے کے آغا حشر کشمیری، احسن لکھنوی یا دو ایک اور گنتی کے ڈرامہ نگاروں نے ادب کے اس خاص حصہ کے ترقی دینے میں کافی سرگرمی دکھائی اور اسمیں شبہ نہیں کہ انکی ترقی میں انکا بڑا ہاتھ ہے۔ انکی کوششیں کسی طرح بھلائی نہیں جا سکتیں۔ مگر یہ اسوقت کی بات ہے جب ہماری نظر افادیت اور دوسرے ذہنی و سماجی تغیرات سے زیادہ تفریح اور خوش باشی پر تھی۔ اور ہمارا ذہن منظر سے آگے بڑھکر پس منظر دیکھنے کا عادی نہ تھا۔ اب جبکہ دنیا کا مطمح نظر پہلے سے بالکل مختلف ہے۔ دوڑنے والوں نے پرانی ڈگر چھوڑ کر نئی طرز کی سڑک پہ بھاگنا شروع کر دیا ہے روز بروز دماغوں پر ترقی پسند رجحانات غالب آتے جاتے ہیں، لازماً حالات کی ان تبدیلیوں سے ادب کے اس شعبہ میں بھی تبدیلی کے امکانات پیدا ہوئے اور ہمارے نوجوان ادیب اس پر دوسرے نقطۂ نظر سے سوچنے اور لکھنے لگے اسے موجودہ حالات کے لحاظ سے مفید اور کارآمد بنانے اور ترقی یافتہ زبانوں میں اس کا جو معیار آج قائم ہو چکا ہے۔ اس معیار تک پہنچنے کے لئے کوشش کرنے لگے۔ یہ ڈرامہ نمبر اسی سلسلہ کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ اس کے اکثر ڈرامے مفید اور پڑھنے کے قابل ہیں۔ بعض ترجمے ہیں لیکن وہ بھی سطحی نہیں ہیں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ادب لطیف کے کارکنوں نے ایسے ہی ڈراموں کو جگہ دی ہے جنہیں ذہنی وسیاسی، سماجی اور تعلیمی انقلاب کا کوئی پہلو ضرور ہے۔ ڈرامہ نویسی کی تاریخ اور اس کے دوسرے اصناف پر بعض مختصر مقالے بھی ہیں، ان میں پروفیسر سید اختر اورینوی ایم اے کا مقالہ "ڈرامہ نویسی فنی نقطۂ نظر سے" اختصار کے باوجود ہمیں پسند ہے۔ اگر ادب لطیف میں یہ حسن انتخاب باقی رہا اور اس کے صفحات کو بازاری چیزوں سے آلودہ نہیں کیا گیا تو امید ہے ادب میں وہ اپنا ایک خاص مقام پیدا کرے گا۔ "ع۔ ن"

تفسیر سورہ عصر

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورہ عصر کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ تفسیر خصوصیت کے ساتھ بعض دقیق مباحث قرآنی کی حامل ہے۔ لفظ عصر کی تحقیق اور زمانہ کے قسم کی تاویل نہایت بصیرت افروز ہے۔ آخر میں ایمان کے مفہوم اور حق و صبر کے باہمی تعلق کی تشریح بھی بڑی اثر انگیز اور ایمان افروز ہے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۶۲ صفحے۔ کاغذ عمدہ۔ کتابت و طباعت جاذب نظر۔ قیمت ۶ر ۸

تفسیر سورہ لہب

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی تفسیر سورہ لہب کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں عام خیال کی مدلل تردید کی گئی ہے کہ یہ سورہ بددعا ہے۔ ابولہب اور اس کی بیوی کے وجوہ ذکر نہایت اثر انگیز ہیں۔ اس تفسیر کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا۔ کتابت و طباعت بہترین، کاغذ نہایت عمدہ۔ حجم ۴۰ صفحے۔ قیمت ۶ر

تفسیر سورہ کافرون

اس میں ہجرت اور برأت کا اصلی فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ اور نبوت کے مراحل و مقامات کی توضیح اس قدر حکیمانہ انداز میں کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی بیشمار مشکلات آپ سے آپ حل ہو گئی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ عمدہ۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ صفحات ۸۴ صفحے۔ قیمت ۳ر

منیجر

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۹۰۲

دائرہ حمیدیہ کی اعانت

دائرہ حمیدیہ کی خدمت و اعانت، کتاب الٰہی کی خدمت و اعانت ہے۔ اسکی تین صورتیں ہیں۔

(۱) جو حضرات سو روپے یکمشت دائرہ کو عنایت فرمائیں گے وہ دائرہ کے معاون دائمی تصور ہوں گے۔ ان کو دائرہ کا رسالہ الاصلاح اور تمام مطبوعات ہدیۃً دی جائیں گی۔

(۲) جو حضرات پچاس روپے یکمشت عنایت فرمائیں گے ان کو رسالہ الاصلاح اور دائرہ کی دوسری مطبوعات برابر نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

۳۔ جو حضرات دس روپے سالانہ عنایت فرمائیں گے ان کی خدمت میں الاصلاح ہدیۃً جاری کیا جائے گا اور سال بھر کی مطبوعات بلا قیمت بھیجی جائیں گی۔

ہدایات و قواعد

۱۔ "الاصلاح" ہر انگریزی مہینہ کی پندرہ تک شائع ہوگا۔

۲۔ اگر مہینہ کے آخر تک پرچہ نہ پہنچے تو فوراً دفتر کو لکھ کر منگوا لیجئے، ورنہ بقیمت بھیجا جائے گا۔

۳۔ مضامین وغیرہ اڈیٹر کے نام بھیجئے اور دفتر سے متعلق امور کیلئے تمام خط و کتابت منیجر سے کیجئے۔

۴۔ دفتر سے خط و کتابت کرنے میں خریداروں کو نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے۔

۵۔ چندہ سالانہ چار روپے۔ بیرون ہند کے لئے چھ روپے۔ فی پرچہ چھ آنے۔

عبدالاحد اصلاحی۔ منیجر دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڑھ

عبدالاحد اصلاحی طابع و ناشر نے اصلاح پریس سرائے میر اعظم گڑھ میں چھپوا کر شائع کیا۔

الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی
DELHI.

دائرۂ حمیدیہ کی اُردو مطبوعات

تفسیر سورۂ اخلاص

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر اردو میں کی ہے۔ اس سورہ کی، ہر دور میں بیشمار تفسیریں لکھی گئیں۔ لیکن اہل نظر نے اعتراف کیا ہے کہ مولانا فراہی کی تفسیر میں جو نکتے بیان ہوئے ہیں، ان سے تمام تفسیریں خالی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین کاغذ نہایت عمدہ۔ قیمت :- ۵/

تفسیر سورۂ والتین

استاذ امام علامہ فراہی رحمہ اللہ کی تفسیر سورۂ والتین کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں تین، زیتون، طور سینین اور بلد امین سے وجوہ استشہاد اور ان کی تحقیق کے متعلق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ تحقیق اور وسعت نظر کا اعجاز ہے۔ قیمت ۲/

تفسیر سورۂ کوثر

استاذ امام مولانا فراہی رحمہ اللہ کی تفسیر سورۂ کوثر کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں کوثر کی تحقیق، خانۂ کعبہ کی روحانی حقیقت اور نماز اور قربانی کے اسرار و حقائق پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت و طباعت جاذب نظر تقطیع $\frac{۲۰×۳۰}{۱۶}$ حجم ۱۲۲ صفحے۔ قیمت ۸/

جلد ۴ | ماہ رجب ۱۳۵۸ھ مطابق ستمبر ۱۹۳۹ء | نمبر

جامعہ ملیہ دہلی
DELHI.

فہرست مضامین

شذرات	امین احسن اصلاحی	۸-۲

معارف قرآن

تفسیر سورہ ذاریات	استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ	۱۹-۹
اقسام القرآن	〃 〃 〃	۳۹-۲۰

مذاکرہ

ہمارے علما کے فقہی اختلافات	امین احسن اصلاحی	۴۰-۳۰
سورہ تحریم اور ذبح کے متعلق بعض شکوک	〃 〃	۵۲-۴۱

حکمت غرب

مارکس اینگلس کے خیالات	جناب مولوی نیاز احمد صاحب صدیقی ایم اے۔	۵۴-۵۳

تلخیصات

افکار جدیدہ	جناب مولوی وزیر الرحمن صاحب اصلاحی	۵۸-۵۵
تقریظ وتبصرہ	〃 〃 〃	۶۴-۵۹

شذرات

ہر ایک سے پوچھتا ہوں .....؟ آجکل مسلمانوں کے سامنے راہ اور منزل کا سوال بہت آتا ہے لیکن تلاش جسقدر بڑھتی جاتی ہے سراغ راہ اسیقدر ناپید ہوتا جاتا ہے۔

كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيَاطِينُ	اس شخص کے مانند جس کو شیطانوں نے زمین میں
فِي الْأَرْضِ حَيْرَانَ (انعام)	بھٹکا دیا ہو اور وہ حیران و درماندہ ہو
أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ	یا جیسے تاریکیاں ہوں گہری سمندر کے اندر ڈھانکے اسکو موج
مِّن فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ سَحَابٌ	پھر موج کے اوپر موج پھر اسکے اوپر بادل۔ تاریکیوں کے اوپر
ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ	تاریکیاں ہیں جب اپنا ہاتھ نکالتا ہے اسکو سجھائی نہیں
يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ	دیتا۔ اور جسکو خدا روشنی نہ بخشے تو پھر اس کیلئے
اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ	روشنی نہیں ہے۔

حالانکہ قرآن اسی تاریکی سے نکالنے کے لئے آیا تھا۔

كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ	کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے تاکہ تم لوگوں
النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ	کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالو۔

چنانچہ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے نور کے نام سے پکارا ہے۔ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا اور ایمان کے لئے اس نے یہ عظیم الشان مثال اختیار کی ہے۔

اللَّهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ مَثَلُ	اللہ آسمان و زمین کی روشنی ہے اسکی روشنی کی مثال

نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ۔ اَلْمِصْبَاحُ
فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ
دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ
زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ
زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ
نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ
مَنْ يَّشَآءُ (نور)

(یعنی اس کے ایمان کی مثال قلب مومن کے اندر) ایسی ہے جیسے
ایک طاق ہو، اسمیں ایک چراغ دھرا ہو، چراغ ایک شیشہ کے
اندر ہو، شیشہ جیسے ایک چمکتا تارا۔ یہ چراغ زیتون کے
ایک ایسے سرسبز و بار آور درخت کے روغن (پاکیزہ فطرت)
سے جلتا ہے جو نہ مشرق کی طرف ہے نہ مغرب کی طرف
اسکا روغن قریب ہے کہ آگ کے چھوئے بغیر بھڑک اٹھے۔ روشنی کے
اوپر روشنی ہے۔ اللہ اپنی روشنی کی ہدایت اسکو دیتا ہے

[illegible]

پھر مومن اور کافر کے فرق کو ان لفظوں میں واضح کیا ہے۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ
جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ
كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ
مِّنْهَا كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ
مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (انعام)

کیا جو مردہ تھا، پھر ہم نے اسکو زندہ کیا، اور اس کو روشنی
بخشی (قرآن اور ایمان) جسکو لیکر وہ لوگوں میں چلتا ہے
اس کے مانند ہو گا جو تاریکیوں میں پڑا ہو اور اس سے نکلتا
نہ ہو۔ اسی طرح ہم نے کافروں کی نظروں میں ان کے عمل
کھبا دیئے ہیں۔

جب یہ روشنی ہمارے پاس موجود ہے تو ہم ہر قدم پر ٹھوکریں کیوں کھائیں؟ اور ہر راہ چلتے سے راستہ کیوں پوچھیں؟ ہم روزانہ پنجوقتہ نمازوں میں صراط مستقیم کی ہدایت طلب کرتے ہیں۔ لیکن جب اس دعا کے بعد ہی قرآن پکارتا ہے کہ ذٰلک الکتاب، لاریب فیہ، ھدی للمتقین یہ آسمانی کتاب ہے، اس کے آسمانی ہونے میں شبہ نہیں، یہ متقین کیلئے ہدایت بنکر نازل ہوئی ہے۔ تو ہم کیوں نہیں سمجھتے کہ یہ ہماری ہی طلب کا جواب، اور ہماری ہی دعا کی مقبولیت ہے، خدا نے ہماری

اسکے ساتھ ہی اشارہ کر دیا کہ جس صراط مستقیم کے تم طالب ہو یہی ہے اور یہی منعم علیہم کا راستہ ہے۔

لیکن یہ دعا صرف ہماری زبانوں سے نکلتی ہے۔ ہمارے سینوں کے اندر سے نہیں نکلتی۔ اسلئے ایک تلفظ لسان ہو کے رہ گئی ہے۔ ہم بالکل نہیں جانتے کہ ہم کیا مانگتے ہیں اسلئے اسکی قبولیت کی صدا سے ہمارے کان بہرے ہیں۔ بس زیادہ تو ایسے ہیں جو اس روشنی سے بالکل محروم ہو گئے

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا [illegible] انکی مثال اس شخص کی مثال ہو جس نے آگ جلائی پس جب
أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ آگ نے اسکے ارد گرد کو روشن کر دیا، اسکے بعد اللہ نے انکی
وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ۔ روشنی سلب کر لی اور انکو ایسی تاریکیوں کے اندر چھوڑ دیا کہ انہیں

اور کچھ ایسے ہیں جنکے سامنے یہ روشنی تو کبھی کبھی چمکتی ہے لیکن وہ ان کو راستہ دکھانے کے بجائے ان کی آنکھوں کو خیرہ کر کے غائب ہو جاتی ہے۔

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ قریب ہے کہ برق انکی آنکھوں کو اچک لے۔

لیکن ایسا کوئی بھی نہیں جو جعلنا له نورا یمشی به فی الناس کا مصداق ہو اور وہ اسکا عزم کرے کہ تاریکیاں کتنی سخت و شدید ہوں وہ اسی روشنی میں خود بھی چلیگا اور دوسروں کو بھی چلائے گا۔

اسکی وجہ یہ ہے کہ ہم میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو بیمار تو ہیں لیکن انکو بیماری کا کوئی احساس نہیں ہے صم بکم عمی فھم لا یرجعون۔

جنکو بیماری کا احساس ہو ان میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جماعت ہے جو بیمار ہے اور بیماری کا احساس بھی رکھتی ہے لیکن بیماری اور صحت کے متعلق اسکا نظریہ قرآن کے اصولوں سے بالکل مختلف ہے، اسکے نزدیک مال، دولت، حکومت سے محرومی بیماری ہے اور ان چیزوں کا مل جانا صحت ہے۔ ان کے خیال میں ساری شقاوت اور محرومی یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کی باقتضا

قوموں کی طرح ان کے پاس تعیش کے سامان، ظلم کی طاقت، فریب کے اسلحہ، تباہ کن آلات، ڈیکارٹ اور اور ہیوم کا فلسفہ اور روسو اور مل کی سیاسیات کے حربے نہیں ہیں۔ چند قوموں نے ان کو اپنا لیا ہے پس ان میں حصہ بٹاؤ، جسقدر کامیابی ہوجائے اسی قدر صحت و توانائی حاصل ہوگی۔ یہ رہزنوں کے ساتھ برابر کے رہزن اور شریروں کے ساتھ برابر کے شریک بنکر جینا چاہتے ہیں۔ ان میں باہم جرات وہمت کے لحاظ سے فرق ہے۔ کوئی اپنے مطالبہ میں جانباز اور بہادر ہے، کوئی چاپلوس اور بزدل لیکن نظریہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ ذہنی روح دونوں کے اندر ایک ہی ہے۔

دوسری جماعت ان لوگوں کی ہے جو اس نظریہ سے تو متفق نہیں ہیں لیکن قرآن کی روشنی میں چلنے کی ہمت نہیں رکھتے اس لئے وہ تذبذب کی حالت میں ہیں۔ ان کا دل تو یہ چاہتا ہے کہ قرآن کے ساتھ رہیں لیکن ان کے ارادہ اور عمل میں اتنی تاب نہیں کہ وہ اس کا ساتھ دے سکیں پس وہ حیران ہیں کہ کیا کریں۔ ان کے خواہشوں، ان کے کاموں اور ان کی باتوں میں ایک عجیب قسم کا انتشار ہے ان کے قدم آگے بڑھتے ہیں مگر ان کی گردن پیچھے مڑ مڑ کے بھی دیکھتی رہتی ہے۔

کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

ان کی مثال اس مریض کی ہے جو صحت و توانائی تو چاہتا ہے لیکن اپنی خواہشوں اور عادتوں سے بے بس ہے، وہ صحت کا دل سے متمنی ہے لیکن اس پر قادر نہیں کہ اس صحت کیلئے بیماری کے اسباب سے پرہیز کرے صحت کے اصولوں کو اختیار کرے، اپنی لذتوں اور خواہشوں کو قربان کردے، اپنے توہمات اور تعیشات کو خیرباد کہہ دے۔ وہ ان سب میں آلودہ رہ کر تندرست بننا چاہتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی دو متضاد خواہشوں میں مصالحت ناممکن ہے۔

قرآن کی راہ میں وحدت ہے۔ یہ وحدت کسی قسم کے انتشار کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اوپر کی آیتوں میں

آپنے دیکھا کہ ہر جگہ ظلمت جمع ہے اور نور واحد۔ تشتت اور تفرق باطل میں ہوتا ہے۔ حق میں تشتت نہیں ہوتا اور یہی راز ہے کہ حق کی راہ مشکل اور باطل کی راہ آسان ہے۔ پانی کو سطح زمین پر بہا دینا کیا مشکل ہے البتہ اس کو کسی خاص سمت میں، ایک خاص حد کے اندر، ایک خاص چوٹی تک پہنچانا دشوار ہے۔

ارسطو نے اپنی اخلاقیات (Ethics) میں اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے خوب بات کہی ہے کہ "نشانہ خطا کر دینا کچھ مشکل نہیں، مشکل تو نشانہ پر مارنا ہے"۔ پس اگر ہم قرآن اور خدا کے ساتھ رہنے کے خواہشمند ہیں تو ہم اس وحدت کو قربان کر کے خدا کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اور قرآن کا قلم کسی اور فلسفہ پر نہیں لگا سکتے۔ ہم کو اپنی زندگی، اور زندگی کے تمام کاموں، تمام ارادوں، تمام خواہشوں، یہاں تک کہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف میں وحدت پیدا کرنی پڑے گی۔ یعنی ہمارے ہر قول و فعل کا ایک خاص ہدف ہوگا جو قرآن نے اور حامل قرآن کی سیرت نے ہمارے لیے متعین کر دیا ہے۔ اور پھر جب ہم اس قرآن کو لوگوں کے اندر لیکر چلیں گے تو ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہوگا کہ ہم کسی دشوار سے دشوار مرحلہ میں بھی اسکی وحدت کو ٹوٹنے اور منتشر ہونے نہ دیں گے۔

یہ راہ بہت مشکل ہے۔ اتنی مشکل کہ اس سے زیادہ مشکل کوئی راہ نہیں ہے۔ لیکن راہ یہی ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں کسی جماعت کو اس راہ پر چلانا ممکن نہیں۔ وہ قرآن کے بنیادی فلسفہ سے ناواقف ہیں۔ قرآن جس زمانہ میں نازل ہوا اس زمانہ کی دنیا آج سے زیادہ ناسازگار تھی۔ مگر سازگار ہو گئی۔ اصل یہ ہے کہ ہم کو اپنی ذمہ داریوں کے حدود معلوم نہیں ہیں۔ ہم یہ کیوں سوچتے ہیں کہ فلاں بات کو کتنے آدمی مانیں گے؟ کسی کا ماننا یا نہ ماننا تو ہمارے اختیار کی بات نہیں ہے۔ ہمارے اختیار میں تو صرف اسقدر ہے کہ ہم دیکھیں کہ سچائی کیا ہے اور جب سچائی سامنے آجائے تو اسکو انا اول المومنین کہکر پکڑ لیں۔ اور اس طرح کہ وہ ہمارے خیال، قول، عمل ہر چیز کے

اندر چھپ جائے۔ اگر ہمارے نصح و دعوت سے اللہ اس کے لئے تمام دنیا کے دلوں کو کھول دے تو یہ اس کی مہربانی ہے اور اگر ہمارے سایہ کے سوا کوئی ہمارا ساتھ نہ دے تو یہ اس کی مرضی ہے۔ دلوں کی خواہشوں، طبیعتوں کے میلانات، زمانہ کے رجحانات کو دیکھکر پروگرام بنانا تو کاذبوں اور مشرکوں کی سیاست ہے۔ اہل ایمان کو صرف سچائی اور حق پر نگاہ رکھنی چاہئے۔ انکی کامیابی کا پیمانہ سچائی پر استواری اور عزیمت ہے، یمین و یسار کی بھیڑ نہیں۔

بعض لوگ مصلحت کا نام لیں گے۔ بے شبہہ مصلحت ایک چیز ہے جس کا اعتبار دین میں کیا گیا ہے، لیکن مصلحت مقصد کے ساتھ ہونی چاہئے، ترک مقصد کے ساتھ نہیں۔ فٹ بال کا ایک کھلاڑی جس وقت گیند کو گول کی طرف لے جاتا ہے ہر قدم پر مصلحت کو دیکھتا ہے اور اور گیارہ گیارہ حریفوں سے اس کو بچانا، کترانا اور الجھنا پڑتا ہے۔ یہ سب مصلحت ہے لیکن اگر وہ گیند کو چھوڑ کر یا گول کی سمت سے ہٹ کر مصلحت کے داؤں پیچ اختراع کرنے لگے تو اس کھلاڑی کو لوگ احمق کہیں گے۔ پس ہم مصالح کو اختیار کریں لیکن اسی طرح جس طرح فٹ بال کا ایک کھلاڑی کرتا ہے۔ ہم کو اپنے گول تک پہنچنا ہے، دنیا جس بھیس میں چاہے ہمارے سامنے آئے، ہر ایک کے لئے ہمارے سامنے الگ الگ احکام ہیں ہم اسی کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کریں۔ یہاں تک کہ جان دیدیں یا منزل تک پہنچ جائیں۔ یہ احدی الحسنین کی راہ ہے اور یہی راہ پیغمبروں اور قرآن کی راہ ہے۔ فماذا بعد الحق الا الضلال۔

اذکروا ھادم اللذات!! اس مہینہ میں چند در چند غم انگیز واقعات پیش آئے۔ شاہ غلام صابر صاحب جو ہمارے ضلع کے ایک کامیاب مختار، مدرسۃ الاصلاح کے مجلس انتظامی

کے ممبر اور ضلع کی مقامی سیاسیات کی رونق تھے۔ بعارضۂ دق انتقال کر گئے۔

دائرہ حمیدیہ کے صدر جناب حاجی، حافظ، ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب کی پہلی بیوی نے انتقال فرمایا۔ مرحومہ نہایت نیک خصال اور صابرہ خاتون تھیں۔ آخر وقت تک جبکہ ان کے تمام الفاظ بے مفہوم ہو گئے تھے کلمہ توحید ان کی زبان پر برابر جاری رہا اور صاف سنائی دیتا تھا

شیخ محمد صاحب مرحوم کے جوان صاحبزادے شیخ عامر انصاری نے بعارضۂ تپ میعادی انتقال کیا۔

ہم ان تمام مرحومین کے لئے مغفرت کی، اور ان کے اعزا و پس ماندگان کے لئے صبر جمیل کی دعا کرتے ہیں۔

اللھم من احییتہ منا فاحیہ علی الاسلام ومن توفیتہ منا فتوفہ علی الایمان۔

فاتحہ نظام القرآن و تاویل الفرقان بالفرقان (عربی)

یہ کتاب استاذ امام مولنا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی تین کتابوں کا مجموعہ ہے۔ مقدمہ تفسیر نظام القرآن، تفسیر آیۂ بسم اللہ، تفسیر سورہ فاتحہ۔ مقدمہ میں مولانا نے اپنی تفسیر کے تمام اصول بیان کئے ہیں اور ان تمام اصولی مباحث سے تعرض کیا ہے جنکی قرآن پر تدبر کرنیوالے ہر طالب علم کو ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ اصولی مباحث ستر ہیں۔ آخر میں بسم اللہ الرحمن الرحیم اور سورہ فاتحہ کی تفسیر ہے۔ ان تفسیروں میں مصنفؒ نے جو حکیمانہ نکات و حقائق بیان کئے ہیں وہ مطالعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

جو لوگ قرآن مجید کو محققانہ طرز پر سمجھنا چاہتے ہیں ان کیلئے اس مقدمہ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ باطنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی ظاہری کتابت و طباعت اور کاغذ کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت بارہ آنے۔

"منیجر"

USLIM UNIVERS
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی

معارف قرآن

تفسیر سورۂ ذاریات

(۴)

نطق انسانی سے معاد پر استدلال

'مثل ما انکم تنطقون' کے مفہوم پر اگر اس کے ماقبل سے ملاکر غور کیجیے، تو مطلب یہ نکلے گا کہ 'تمہارا مرنے کے بعد اٹھایا جانا اور نیک و بد کاموں کا بدلہ پانا حق یعنی ایک امر واقعی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے، ویسی ہی واقعی جیسا کہ تم بولتے ہو، اور اس میں تم کو ذرا شبہ نہیں ہوتا'۔ اتنی بات بالکل کھلی ہوئی ہے لیکن اس تمثیل میں بہت سی حکمتیں ہیں جو غور و فکر کے بعد سامنے آتی ہیں اور ضروری ہے کہ تھوڑی دیر توقف کرکے ان پر تدبر کیا جائے۔ یہاں طبیعت میں آپ سے آپ ایک خلش پیدا ہوتی ہے کہ قرآن نے اس موقع پر نطق کی مثال کیوں اختیار کی؟ فرمایا جس طرح تم بولتے ہو، یہ کیوں نہیں فرمایا کہ جس طرح تم دیکھتے ہو، جس طرح تم سنتے ہو، جس طرح تم کھاتے ہو، جس طرح تم پیتے ہو وغیرہ وغیرہ۔ جب اس سوال پر تم غور کروگے تو تمہارے سامنے دو نہایت اہم حقیقتیں آئینگی۔ ایک یہ کہ نفس کے تمام مظاہر و حالات میں سب سے زیادہ قابل یقین نطق ہے۔ دوسری یہ کہ نطق میں معاد کی دلیل پنہاں ہے۔ اس اجمال کی تفصیل تمہارے سامنے آئے گی اور

اس سے تم کو معلوم ہوگا کہ ان دونوں اعتبارات سے اس تمثیل میں عقل و دل کی تربیت کیلئے کیسی کیسی بصیرتیں ودیعت ہیں۔

۔ پہلی بات، یعنی نطق کا سب سے زیادہ قابل یقین ہونا، تین پہلوؤں سے ہمارے سامنے آتی ہے۔

الف۔ نطق، نفس کے تمام مظاہر و حالات میں، نفس سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ نفس ہر بات پر فکر کے واسطے سے متنبہ ہوتا ہے اور فکر اور نفس کے مابین کوئی واسطہ نہیں، خود فکر ہی نطق حقیقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل کو نفس ناطقہ بھی کہتے ہیں۔ یہ نطق جو سنا جاتا ہے، یہ تو محض نطق حقیقی کا ظہور ہے۔ پس نفس کے لئے اپنے نطق حقیقی کا علم اس کے لئے سب سے زیادہ بدیہی اور سب سے زیادہ قابل یقین ہے۔

ب۔ نطق نفس کے اندر سب سے زیادہ راسخ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انسان کی فطرت کے اندر داخل اور اس کے خواص میں سے ہے چنانچہ انسان کی تعریف حیوان ناطق سے کی گئی ہے اور یہ ایسی بات ہے کہ عرب بھی اس سے واقف تھے مرقش اکبر کہتا ہے۔

هل بالديار ان تجيب صمم   لو ان حيا ناطقا كلم

ج۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ نفس کے تمام مظاہر و حالات میں سے جتنی گوناگوں تائیدیں اور شہادتیں نطق نے اپنے اندر جمع کرلی ہیں اتنی تائیدیں اور شہادتیں کسی چیز کو بھی حاصل نہیں ہیں اور یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی بات کیلئے شہادتوں اور تائیدوں کی کثرت اس کے بدیہی اور فطری ہونے سے ایک امر زائد ہے۔ اس روشنی میں نطق کی حقیقت پر غور کروگے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ خصوصیت اس کے اندر گوناگوں پہلوؤں سے جمع ہوگئی ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بولنے والا پہلے سوچتا ہے اور یہ سوچنا

نطق حقیقی ہے۔ پھر یہی فکر بالکل ٹھیک ٹھیک اس کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔ پھر زبان سے جو کچھ ادا ہوتا ہے اس کو اس کے کان سنتے ہیں اور وہ دیکھتا ہے کہ زبان کی تعبیر اور کانوں کا سماع بالکل مطابق ہے۔ پھر وہ اپنی گفتگو کے مطابق مخاطب کی طرف سے اس کا جواب پاتا ہے۔ الغرض اس طرح شہادتیں بڑھتی جاتی ہیں یہاں تک کہ لفظ لفظ بلکہ حرف حرف اس مطابقت کی شہادتوں کا انبار لگا دیتا ہے پس معلوم ہوا کہ نفس کے وجود پر نطق سے بڑھکر کوئی دلیل نہیں۔ اسی وجہ سے نفس نطق کو دلیل میں پیش کیا یعنی فرمایا "مثل ما انکم تنطقون" (جس طرح کہ تم بولتے ہو) مثل نطقکم (تمھارے نطق کی طرح) نہیں فرمایا۔ اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ ہر چیز کا یقین درحقیقت یقین بالنطق کی فرع ہے۔ اور تمام یقینیات اور استدلالات کی اصل نطق ہے۔

۲- رہی دوسری بات یعنی اس مثال میں معاد کی دلیل مضمر ہونا سو اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمثیل کبھی تو دعوی محض ہوتی ہے جس کی مثالیں شعراء کے کلام میں اکثر ملتی ہیں اور کبھی اس میں دلیل بھی پنہاں ہوتی ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب یا تو خود کلام کی رہنمائی سے یا عقل سے یہ بات معلوم ہو جائے کہ مثل اور ممثل میں کوئی ایسا امر جامع موجود ہے جو حکم میں ان دونوں کے اشتراک کو مستلزم ہے۔ مثلاً اگر تم کسی نشہ آور چیز کی بابت کہو کہ وہ شراب کی طرح حرام ہے تو اس تمثیل میں گویا تم نے علت حرمت بتادی اور اسی امر جامع کو اصطلاح میں مناط حکم کہتے ہیں۔ پھر اگر مناط حکم مثل کے مقابل میں ممثل (میں زیادہ قوی ہوگا تو اس کے لئے حکم کا ثبوت بطریق اولیٰ ہوگا جس کی واضح ترین مثال قرآن مجید میں "مثل نورہ کمشکوۃ فیہا مصباح" ہے۔

اس قاعدہ کی روشنی میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نطق کی تمثیل یہاں محض دعوی

دعوی نہیں ہے بلکہ یہ معاد کی ایک نہایت قوی دلیل ہے اور اس دلیل کو سمجھنے کیلئے ضرورت ہے کہ نطق انسانی اور معاد کے معاملہ میں اشتراک و مماثلت کے جو وجوہ ہیں وہ ہمارے سامنے آئیں۔ ہم یہاں بعض وجوہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

الف۔ سب سے پہلی چیز تو یہاں نفس قسم ہے قسم کے متعلق ہم اپنی کتاب الامعان فی اقسام القرآن میں ثابت کر چکے ہیں کہ وہ شہادت ہے پس اس موقع پر آسمان و زمین کے پروردگار کو شہادت میں پیش کرنا درانحالیکہ پہلے گذر چکا ہے کہ آسمان و زمین ایسے آثار ربوبیت سے معمور ہیں جو معاد پر دلیل ہیں، گویا ان دونوں کو ان تمام آیات سمیت شہادت میں پیش کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ ان آثار میں سے نطق اہل عقل کے نزدیک سب سے زیادہ واضح و روشن ہے جیسا کہ فرمایا ہے انطقنا اللہ الذی انطق کل شئ (ہم کو اس خدا نے گویا کیا جس نے ہر چیز کو گویا کیا) یا فرمایا وان من شئ الا یسبح بحمدہ۔ (نہیں ہے کوئی شے مگر اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتی ہے) گویا یوں فرمایا کہ جس طرح تم بولتے ہو اسی طرح یہ پوری کائنات بولتی ہے کہ خدا کی طرف لوٹنا حق ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

ب۔ دوسری چیز نطق کی حقیقت پر غور کرنے سے سامنے آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو لفظوں کی تالیف اور ان کو اپنے حسب منشا ادا کرنے کی قدرت عطا فرمائی ہے۔ پھر اس کو اس بات پر بھی قدرت دی ہے کہ وہ اپنے فکر اور نطق کو ٹھیک اعادہ کر سکے بلکہ اعادہ کرنے میں وہ پہلے سے زیادہ خوبی اور صفائی کا اظہار کر سکتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے جس کا اس نے خاص طور پر ذکر فرمایا ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ   انسان کو بنایا اور اس کو بیان کی تعلیم دی۔

اگر انسان اپنی اس قدرت پر غور کرے تو وہ اس بات میں شبہ نہیں کرسکتا کہ اللہ تعالی دنیا کو فنا ہونے کے بعد دوبارہ پیدا کرسکتا ہے کیونکہ یہ تمام کائنات مجرد اس کے نطق سے وجود میں آئی ہے۔ اللہ تعالی جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو وہ کسی مادہ اور آلہ کا محتاج نہیں ہوتا، صرف اپنے ایک کلمہ سے اس کو پیدا کردیتا ہے۔

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ
نَّقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ

جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اس کیلئے ہمارا
کہنا صرف یہی ہو کہ ہم کہتے ہیں کہ ہوجا پس وہ ہوجاتی ہے

یہ تمام کائنات خدا کے ایک کلمہ سے وجود میں آئی ہے۔ ایک کلمہ سے اس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا اور جب چاہے گا ایک ہی کلمہ سے اسکا اعادہ بھی فرمائے گا۔ بلکہ دوبارہ پیدا کرنا اس کیلئے اور بھی سہل ہو۔

وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ
يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ

وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر اسکا اعادہ
کریگا اور اعادہ اس پر زیادہ سہل ہے

اور جب یہ حقیقت اپنی جگہ پر واضح ہے تو وہ انسان کے اعادہ پر اور بھی زیادہ قادر ہے۔

أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ
وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَى أَن يَخْلُقَ مِثْلَهُم
بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ ۔ إِنَّمَا
أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَن يَقُولَ
لَهُ كُن فَيَكُونُ فَسُبْحَانَ الَّذِي
بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ
تُرْجَعُونَ

کیا وہ ذات جس نے آسمانوں و زمین کو بنایا اس
بات پر قادر نہیں ہے کہ اسکے مثل پیدا کرے
(یعنی موت کے بعد ان کو دوبارہ پیدا کرے کیونکہ
سیاق کلام اثبات معاد کا ہے اور اس امر کی وضاحت
دوسری مقامات میں بھی ہوئی ہو کیونکہ نفس آسمان
و زمین کی خلقت اس بات پر دلیل ہو کہ وہ انسان کو
دوبارہ پیدا کرسکتا ہے اور اسکی تصریح ان آیات
میں ہو جنمیں معاد کا اثبات محض خدا کی صفت
خلق و علم سے ہو اور اس کا اشارہ یہاں بھی ہو
چنانچہ فرمایا) ہاں وہ بھی پیدا کرنیوالا اور علم والا ہے
اسکا حکم جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہی یہ ہے کہ
ہے ۲ وہ اسکو کہتا ہو کہ ہوجا پس وہ ہوجاتی ہو پس پاک ہو وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی قدرت ہو اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤگے۔

اسی طرح معاد کے متعلق دوسری جگہ فرمایا ہے اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ۔

غرض نطق میں اس بات کی نہایت کھلی ہوئی شہادت ہے کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ پیدا کرنے پر اس سے زیادہ قادر ہے جتنا صاحب نطق اپنے نطق کے اعادہ پر۔ کیونکہ اعادہ نطق میں آدمی ان اسباب کا محتاج ہوتا ہے جو اس کے لئے قدرت نے مقرر کر دیئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کسی چیز کا بھی محتاج نہیں پھر یہ کہ انسان بعض اوقات اپنی بات نہیں دہرا سکتا۔ یا کل یا اس کا کچھ حصہ بھول جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ خلق کو دوبارہ پیدا کرنے پر اسی طرح قادر ہے جس طرح اس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا۔ أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَلَّنْ نَجْمَعَ عِظَامَهُ بَلَىٰ قَادِرِينَ عَلَىٰ أَنْ نُسَوِّيَ بَنَانَهُ (قیامہ) دوسری جگہ فرمایا ہے۔ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ۔ ایک اور جگہ ہے۔ قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ، قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ۔

اثبات معاد پر یہ استدلال ان لوگوں کے جواب میں ہے جو معاد کا انکار محض استبعاد کی وجہ سے کرتے تھے۔

ج۔ نطق کی ایک ضروری خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ناطق کی طرف لوٹے ورنہ ناطق بہرا ہوگا اور بہرے کے لئے گونگا ہونا بھی شرط ہے۔ پس نطق کی اس حقیقت کے لحاظ سے ضروری ہے کہ یہ تمام مخلوق اپنے خالق کی طرف لوٹے کیونکہ یہ تمام خلق اللہ تعالیٰ کے حکم سے قائم ہے اور اس کے ملک اور قدرت سے کبھی باہر نہیں ہو سکتی۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ۔

پس یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خلق کرے اور تمام مخلوق اس کی طرف نہ لوٹے۔ کیا وہ بولے گا اور سنے گا نہیں؟ پیدا کرے گا اور دیکھے گا نہیں؟ خلق کو پردۂ عدم سے وجود میں لائے گا پھر یہ خلق اس کے قبضہ قدرت اور احاطہ تدبیر سے باہر نکل جائے گی اور اس کے اختیار میں کچھ نہیں باقی رہ جائے گا؟

یہ استدلال ان لوگوں کے لئے ہے جو معاد کو اس وجہ سے مستبعد سمجھتے ہیں کہ ان کے نزدیک معدوم کا رجوع مستبعد ہے اور قرآن نے ان کے شبہہ کو جگہ جگہ نقل کیا ہے۔ مثلاً

أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ	کیا ہم جب مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے تو دوبارہ
رَجْعٌ بَعِيدٌ ۔ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ	اٹھائے جائیں گے۔ یہ اٹھایا جانا تو بہت مستبعد ہو
الْأَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتَابٌ	ہم جانتے ہیں جو کچھ ان میں سے زمین کم کرتی ہے
حَفِيظٌ	اور ہمارے پاس حفاظت کرنیوالی کتاب ہے۔

دوسری جگہ اس سے زیادہ وضاحت و تفصیل کے ساتھ ہے۔ قَالُوا أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ۔ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ إِنْ هٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۔ قُلْ لِمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۔ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۔ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۔ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۔ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۔ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ قُلْ فَأَنّٰى تُسْحَرُونَ ۔

اس آیت میں کس تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے، وہ سب کا مالک ہے، سب کا پروردگار ہے، سارا کارخانہ اس کے ہاتھ میں ہے، وہی پناہ دینے والا ہے اور وہی حفاظت کرنے والا ہے اور یہ ملکیت سے اعادہ پر استدلال

قرآن مجید میں بہت ہے۔ یہاں استقصاء کی ضرورت نہیں ہے۔

د۔ استدلال کا چوتھا پہلو صفت ربوبیت و عدل اور نطق سے اس کی مماثلت پر قائم ہے۔ قرآن مجید میں یہ استدلال مختلف نہج سے بیان ہوا ہے۔ اور یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ عدل ربوبیت کے اندر داخل ہے۔ چنانچہ قرآن صاف لفظوں میں اعلان کرتا ہے کہ آسمان وزمین کا قیام عدل سے ہے۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَهُمْ	اگر حق ان کی خواہشوں کی پیروی کرتا تو
لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ	آسمان وزمین اور جو ان کے اندر ہیں سب
وَمَنْ فِيْهِنَّ	تباہ ہو جاتے۔

پس موقع زیر بحث میں بھی آسمان وزمین اور ان کی نشانیوں کے ذکر کے بعد ربوبیت سے معاد پر استدلال فرمایا اور اس کے لیے نطق کی مثال اختیار کی، گویا استدلال کی پوری تقریر یوں ہوگی کہ تم جو کچھ بھی کرتے دھرتے ہو اس کا آغاز ایک فکر و تدبر اور نطق نفسی سے کرتے ہو اور تمہاری یہی صفت ہے جو تم کو نفس ناطقہ سے محروم اشیاء و مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ پس جب تمہاری یہ صفت ہے تو اللہ تعالیٰ بھی عادل اور حکیم ہے۔ چنانچہ اس کائنات میں جس قدر عجائب قدرت و صنعت تم دیکھتے ہو ان سب میں اس امر کی شہادت موجود ہے کہ یہ ایک حکیم و مدبر کے علم و تدبیر سے وجود میں آئی ہے جو اس بات کی ناقابل انکار دلیل ہے کہ ان سب کے اندر ایک عظیم الشان غایت اور حکمت و رحمت مضمر ہے۔ اور یہیں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ تم کو خدا نے بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ پس ضرور ہے کہ ہر عمل کو اس کے عمل کا پورا بدلہ دے اور برے اور بھلے کے درمیان امتیاز کرے۔ اس بات کو دوسرے مقامات میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ	کیا ہم فرمانبرداروں کو نافرمانوں کی طرح کرینگے
مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ	تم کو کیا ہو گیا ہے تم کیسا فیصلہ کرتے ہو۔

دوسری جگہ فرمایا ہے :-

إِنَّهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ	بیشک وہ خلق کا آغاز کرتا ہے پھر اس کا
لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ	اعادہ کریگا تاکہ ان لوگوں کو عدل کے ساتھ بدلہ
بِالْقِسْطِ	دے جو ایمان لائے اور جنھوں نے بھلائیاں کیں

اسی طرح فرمایا ہے :- وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ذَٰلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ۔

یہ بات قرآن مجید میں مختلف مقامات میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ لیکن روح حقیقت سب میں ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ حکمت، رحمت اور عدل معاد کو مستلزم ہیں۔ غرض یہاں فرمایا ہے کہ جس طرح تم ایک فکر اور مقصود کو سامنے رکھکر بولتے ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین اور نفوس کو ایک غایت و مقصد کے لئے پیدا کیا ہے جس کی طرف یہ سب لوگ لوٹیں گے اور چونکہ اللہ تعالیٰ کمال حکمت و عدل سے متصف ہے اس لئے اس کے کاموں میں لازماً کمال عدل و حکمت کا ظہور لازمی ہے۔ یہ چند اشارات مذکور ہوئے، باقی اللہ تعالیٰ کے کلام کی حکمتوں کا اس کے سوا کون احاطہ کرسکتا ہے؟[1]

---

[1] (مثل ما انکم تنطقون) سے مولاناؒ نے جو حکیمانہ نکتے پیدا کئے ہیں وہ اپنی جگہ پر نہایت قیمتی ہیں لیکن مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ خود مولاناؒ کے اصول پر اس کی ایک دوسری نہایت مختصر اور خوبصورت تاویل ہو سکتی ہے وہ یہ کہ تمہارا مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جانا اور بدلہ پانا ہو کے رہیگا اور اس کا واقع ہونا ایسا ہی ہے جیسا تمہارا کسی بات کا بولنا دنیا
(باقی حاشیہ ص۱۸ پر)

ان آیات کا نظم باہمدگر اور انکا تعلق سابق ولاحق سے

۱۰۔ اس کلام میں حسن ترتیب کا جو اہتمام اور اقرب فالاقرب کے اصول کی جو رعایت بدرجہ کمال موجود ہے، اوپر کے مباحث نے اس کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔ وفی الارض سے لیکر " وماتوعدون" تک زمین، پھر نفس، پھر آسمان کا ذکر فرمایا ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ نفس ان دونوں کے بیچ کی کڑی ہے اور اس کے دو پہلو ہیں جو اس کو دونوں طرف سے جوڑتے ہیں۔ ان کا ذکر فرماکر اللہ تعالیٰ نے ان نشانیوں کی طرف متوجہ کیا ہے جو ان کے اندر موجود ہیں۔ پھر اس کے بعد فورب السموات والارض فرماکر اصلی دلیل جامع یعنی ربوبیت سے استدلال کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اس کے بعد فرمایا مثل ما انکم تنطقون۔ یہ سابق استدلال کی مزید تائید ایک ایسی تمثیل سے کی گئی ہے جو درحقیقت نفس سے ماخوذ ہے جو آسمان وزمین کا آئینہ ہے اور اس میں اشارہ وفی انفسکم افلا تبصرون کی طرف ہے۔

علاوہ ازیں نطق کی مثال اس پہلو سے بھی اختیار کی گئی کہ وہ یقین واستدلال کی اصل ہے اور اس جہت سے یہ تمثیل آیات للموقنین کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

یہ آیات کا نظم باہمدگر ہے۔ رہا ان کا تعلق سابق ولاحق سے تو اوپر گذر چکا ہے کہ وفی الارض آیات للموقنین سے لیکر مثل ما انکم تنطقون تک پورا جملہ ان دلائل

(بقیہ حاشیہ ص۱۱) یعنی اللہ تعالیٰ کیلئے تمہارا دوبارہ پیدا کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ نہایت سہل اور آسان ہے، جس سہولت کے ساتھ تم ایک لفظ زبان سے ادا کر دیتے ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ ایک کلمہ کن کے ذریعہ اس خلق کو جب چاہے گا دوبارہ اٹھا کر کھڑا کر دیگا یہ تاویل ہر پہلو سے استاذ امامؒ کے اصول تاویل کے مطابق ہے یہاں تفصیل کا محل نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (مترجم)

پر معطوف ہے جو سورت کے شروع میں بیان ہوئے ہیں۔ یعنی سورت کے شروع سے یہاں تک تمام تر امور فطرت نے استدلال ہے چنانچہ پہلے ہوا، بادل، زمین، آسمان اور نفس کی شہادت پیش کی اور اس کے بعد تاریخی واقعات سے اس شہادت کی مزید تائید کی۔ اس اسلوب کی مثال سورہ شمس میں موجود ہے اور ہم نے اس سورۃ کی تفسیر میں اس پر مفصل بحث کی ہے اور یہ اسلوب قرآن مجید کا بہت معروف اسلوب ہے چنانچہ تم قرآن مجید میں اکثر پاؤ گے کہ فطری دلائل کی تائید میں تاریخی واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ اسی اصول پر یہاں بھی مناسب ہوا کہ مشہور تاریخی واقعات سے جزا کی مثالیں پیش کی جائیں تاکہ مخاطب کو تنبہ ہو اور ایک بڑے روز جزا کا یقین ان کے دلوں میں جگہ پکڑ سکے۔ جیسا کہ فرمایا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَا	اور تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہے جبکہ وہ بستیوں کو
اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ اِنَّ	پکڑتا ہے ظلم (شرک) کی حالت میں بے شک
اَخْذَهٗ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ۔ اِنَّ فِيْ	اس کی پکڑ سخت اور دردناک ہے۔ اس میں
ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ	نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو آخرت کے
الْاٰخِرَةِ	عذاب سے ڈرتے ہیں۔

پھر موقع کلام کی مناسبت مقتضی ہوئی کہ یہاں مثال کے لئے ایسے تاریخی واقعات چنے جائیں جو ان قسموں کو ممثل کر دیں جو اللہ تعالیٰ نے شروع میں کھائی ہیں تاکہ یہ قسم براعت استہلال کی ایک بہترین مثال ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور اس پر آگے ہم بحث کرینگے۔

پھر فرمایا۔ هل اتاك حديث ضيف ابراهيم المكرمين الى . يخافون العذاب الاليم۔

(باقی)

اقسام القرآن

۵

قسم بغرض استدلال

۱۔ اوپر کی تفصیلات سے یہ بات صاف ہو گئی کہ اہل عرب قسم میں اپنی جان کی شہادت یا اللہ تعالیٰ کی شہادت پیش کرتے تھے، اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی شہادت سب سے بڑی شہادت تھی اس لئے اس کا رواج زیادہ ہوا اس سے ان لوگوں کو جو عربی کے اسالیب اور آداب بلاغت سے اچھی طرح واقف نہ تھے یہ غلط فہمی ہو گئی کہ شہادت میں صرف معبود کو پیش کیا جاتا ہے اور اس میں ہمیشہ مقسم بہ کی تعظیم کا پہلو مدنظر ہوتا ہے۔ لیکن جب تم کلام عرب پر غور کرو گے تو تمھیں معلوم ہوگا کہ اہل عرب بسا اوقات ایسی چیزوں کو شہادت میں پیش کرتے تھے جن کو نہ تو پوجتے تھے اور نہ ان کی کسی طرح کی تعظیم ہی کرتے تھے۔ بلکہ قسم سے مقصود محض اپنی بات پر دلیل لانا ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ مذہبی قسموں میں بھی بسا اوقات استدلال کا پہلو مضمر ہوتا تھا جس کی تفصیل پندرہویں فصل میں تمھارے سامنے آئے گی۔ یہاں ہم محض استدلالی قسم کے بیان پر کفایت کرتے ہیں اور کلام عرب سے اپنے دعوے کے ثبوت میں دلائل پیش کرتے ہیں۔

ابو العریان طائی حاتم کی مدح میں کہتا ہے۔

قد علموا والقدور معلمه   ومستهل الغرار مطرد
لوگ جانتے ہیں اور دیگیں گواہ ہیں   اور پیہم چلنے والی چمکدار چھریاں

ان لیس عند اعتراء طارقها[1]　　　لدیک الا استلالها مدی

کہ زمانہ قحط کے کسی شب آہنگ کی میزبانی میں تیری طرف سے صرف اتنی تاخیر ہوتی ہے جتنی دیر میں (کسی جانور کو ذبح کرنے کیلئے) تراپی

راعی کے شعر ہیں۔

ان السماء وان الریح شاهدة　　　والارض تشهد والایام والبلد

آسمان اور ہوا شاہد ہیں، زمین شاہد ہے جگہیں شاہد ہیں اور سرزمین شاہد ہے۔

لقد جزیت بنی بدر بسعیتها　　　یوم الهباءة یوما ماله قود

کہ میں نے بنی بدر کو ہباءہ کی لڑائی میں انکی سرکشی کا مزہ چکھایا۔ ایسی لڑائی کہ اس کا بدلہ ممکن نہیں

نابغہ ذبیانی کہتا ہے۔

والخیل تعلم اننا فی تجاولنا　　　عند الطعان اولو بوسی وانعام

شہسوار جانتے ہیں (گواہ ہیں) کہ ہم نیزہ بازی میں جولانی کے وقت کسی کیلئے تازیانہ عذاب ہیں اور کسی کیلئے رحمت۔

عنترہ کا شعر ہے۔

والخیل تعلم والفوارس اننی　　　فرقت جمعهم بطعنة فیصل

گھوڑے اور شہسوار گواہ ہیں کہ میں نے ایک فیصلہ کن نیزہ بازی سے ان کی جمعیت منتشر کر دی

ان مثالوں میں دیکھو ان شاعروں نے، دیگوں، چھریوں، آسمان، زمین، جنگوں، سرزمین اور گھوڑوں، شہسواروں کو گواہی میں پیش کیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کو پیش کرنے کا مطلب یہی ہے کہ اگر تم ان سے پوچھو اور یہ جواب دے سکیں تو یہ ہمارے دعوے کی تصدیق کریں گے۔

اس دعویٰ کی تائید میں فضل بن عیسیٰ ابان کا یہ وعظ بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔

---

[1] نسخوں میں طارف کی روایت ہے مگر مصنف نے "طارق" لکھا ہے اور بوجوہ مجھکو یہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ (مترجم)

سل الارض فقل من شق	زمین سے پوچھ، تیری نہریں کس نے جاری کیں
انهارك وغرس اشجارك	تیرے درخت کس نے لگائے، تیرے پھل کس نے
وجنى ثمارك فان لم تجبك	چنے۔ اگر زبان قال سے جواب نہ دے گی
حوارا اجابتك اعتبارا	تو زبان حال سے جواب دے گی

اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام صحف ایوبؑ باب ۱۲ ۷۔ ۱۰ سے ماخوذ ہے۔

حیوانوں سے پوچھ اور وہ تجھے سکھائیں گے۔
اور ہوا کے پرندوں سے دریافت کر اور وہ تجھے بتائیں گے۔
یا زمین سے بات کر اور وہ تجھے سکھائے گی
اور سمندر کی مچھلیاں تجھ سے بیان کریں گی۔

کون نہیں جانتا کہ ان سب باتوں میں خداوند ہی کا ہاتھ ہے جس نے یہ سب بنایا؟ اسی کے ہاتھ میں ہر جاندار کی جان اور کل بنی آدم کا دم ہے۔

بالکل اسی کے مثل کلام تثنیہ باب ۳۰ ۱۹ میں ہے۔

"میں آج کے دن آسمان و زمین کو تمہارے برخلاف گواہ بناتا ہوں کہ میں نے زندگی اور موت کو اور برکت اور لعنت کو تیرے آگے رکھا ہے پس تو زندگی کو اختیار کر کہ تو بھی جیتا رہے اور تیری اولاد بھی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے ساتھ میرا یہ عہد کوئی رازدارانہ کارروائی نہیں ہے۔ بلکہ ایک علانیہ اور مشتہر بات ہے پس اگر تم اس کو توڑو گے تو اس کا ننگ ہمیشہ کے لئے تم سے چمٹ جائے گا۔ اس زمین کی پشت پر اور اس آسمان کے نیچے جب تک جیو گے تمہارے اوپر اور نیچے سے تم پر عذاب اور لعنت کی بارش ہوتی رہے گی۔ پس عہد کے [illegible]

اور نقض عہد کے نتائج کے لزوم کو بیان کرنے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر دو ایسے گواہ قائم کر دیئے جو ان پر ہمیشہ مسلط رہیں گے۔

لسانِ حال سے شہادت دینے والی چیزوں کی قسم کے بارہ میں ممکن ہے کسی کو شبہ ہو کہ یہ تمام تر "یشہد" اور "یعلم" وغیرہ کے الفاظ کے ساتھ آئی ہیں۔ چنانچہ اوپر جو مثالیں ہم نے پیش کی ہیں ان میں یہ الفاظ موجود ہیں۔ لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے۔ کلام عرب کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس طرح کی چیزوں کی قسم ان الفاظ کے ساتھ بھی کھاتے ہیں جو قسم کیلئے مخصوص ہیں۔ مثلاً "واؤ قسم" یا "لعمر" وغیرہ کے الفاظ۔ پس اگر اوپر کی مثالوں سے کسی کا دل مطمئن نہ ہو تو اس کی واضح اور صریح مثالیں بھی موجود ہیں۔

عروہ بن مرہ ہذلی کا شعر ہے۔

وقال ابو امامة يا لبكر   فقلت ومرخة دعوى كبير

اور ابو امامہ نے پکارا اے قبیلہ بکر کے لوگو مدد کرو! میں نے کہا مرخ کی قسم بڑی خوفناک پکار ہے!

ابو امامہ نے قبیلہ بکر سے مدد چاہی ہے اس پر شاعر ابو امامہ کا مذاق اڑا رہا ہے کہ کیسے زبردست لوگوں سے مدد چاہی گئی ہے!! اور کیا خوفناک استغاثہ ہے! اور اس نے ایک کمزور درخت (مرخ) کی قسم کھائی ہے جو اپنے سایہ کے نیچے ایک شخص کو بھی پناہ نہیں دے سکتا اور عربی ادب میں ضعف و ناتوانی کی مثال کے لئے مخصوص ہے۔

ابو جندب ہذلی نے اس قسم کی اصلی حقیقت پوری طرح واضح کر دی ہے۔

وكنت اذا جارى دعا لمضوفة   اشمر حتى ينصف الساق مئزري

میرا حال یہ ہے کہ جب میرا پڑوسی کسی ضرورت میں مجھ سے طالب مدد ہوتا ہے میں فوراً اس کے لئے چاق چوبند ہو جاتا ہوں۔

"فلا تحسبا جاری لدی ظل مرخة   ولا تحسبنه فقع قاع بقرقر"

پس میرے پڑوسی کو کسی "مرخہ" کے سایہ کے نیچے مت سمجھو اور نہ کسی نشیبی زمین کی نرم گھاس سمجھو۔

بجرس نے اپنے باپ کے قاتل جساس کو قتل کرتے وقت جو قسم کھائی وہ بھی اس ذیل میں پیش کی جا سکتی ہے، اس نے کہا۔

وفرسی واذنیه ورمحی ونصله   میرے گھوڑے کی قسم اور اسکی کنوتیوں کی، تیر
وسیفی وغراریه لا یترک الرجل   کی قسم اور اسکی نوک کی، میری تلوار کی قسم اور اسکی دھار کی کہ
قاتل ابیه وهو ینظر الیه   آدمی اپنے باپ کے قاتل کو دیکھ کر نہیں چھوڑ سکتا۔

بجرس نے ان تمام چیزوں کی قسم بطور ثبوت اور شہادت کے کھائی ہے۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں نیزہ بازی اور شمشیر زنی اور حملہ اور دفاع میں ماہر ہونے کے باوجود اپنے باپ کے قاتل کو بچ کے نکل جانے کی فرصت کیسے دے سکتا ہوں۔ اس پر اس نے انہی چیزوں کی قسم کھائی ہے جن سے اس کے دعوی کی تصدیق اور اس کے قول کی توثیق ہوتی ہے۔

طرفہ کی ایک قسم بھی اس ذیل کی ہے۔

وقربة ذی القربی وجدک اننی   متی یک امر للنکیثة اشهد

قرابت مندوں کے رشتہ قرابت کی قسم اور تیرے جد کی قسم جب کوئی بڑا معاملہ امتحان کا پیش آئیگا۔

تو میں جان و مال سے حاضر ہوں گا۔

مطلب یہ ہے کہ جب تمام اہل قرابت کسی بڑے مقصد کیلئے مجتمع ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اس میں شریک نہ ہوں اور رحم کا پاس، جو ایک عظیم الشان ذمہ داری ہے، اس سے غفلت برتوں۔ اہل عرب کے ہاں رحم اور جد دو چیزیں تمام معاشرتی و اجتماعی

تعلقات کی بنیاد تھیں۔ شاعر نے اپنی شرکت کو ضروری بتانے کے لئے اسی رشتہ رحم کو بطور دلیل شہادت میں پیش کیا ہے۔

حصین بن حمام اپنے دوست نعیم بن حارث کے مرثیہ میں کہتا ہے۔

قتلنا خمسة ورموا نعيما　　وكان القتل للفتيان زينا

ہم نے پانچ کو قتل کیا اور انھوں نے نعیم کو نشانہ بنایا اور قتل ہونا نوجوانوں کے لئے شرف ہے۔

لعمر الباكيات على نعيم　　لقد جلت رزيته علينا

نعیم پر ماتم کرنے والیوں کی قسم!　　نعیم کا قتل ہمارے لئے سخت مصیبت ہے۔

یہاں ماتم کرنے والی عورتوں کی قسم اس وجہ سے کھائی ہے کہ ان کی حالت درحقیقت اس حادثہ کی نوعیت پر گواہ ہے۔

قسم کی یہ نوع، اگرچہ اپنی باریکیوں اور دوسری انواع قسم کے شیوع کی وجہ سے، کچھ زیادہ نہ پھیل سکی تاہم عربی زبان میں ایک معروف و مشہور اسلوب ہے جس میں بلاغت کلام کے سب شاہ ابواب، جیسا کہ سترہویں فصل میں معلوم ہوگا، جمع ہو گئے ہیں۔ بلکہ نہایت قابل اطمینان دلائل کی بنا پر ہم یہ دعوی کرتے ہیں کہ یہ اسلوب عرب اور عجم دونوں میں معروف ہے۔ اور نامناسب نہ ہوگا اگر ہم اپنے دعوی کی تصدیق کے لئے یونانی ادب سے اس کی بعض مثالیں پیش کریں۔

قسم بطور استدلال ڈیموس تھینز کے کلام میں

یونان کے لوگ ابتداءً بالکل آزاد تھے۔ وہاں کا نظام حکومت جمہوری تھا۔ شخصی حکومت کے اقتدار سے یہ لوگ بالکل ناآشنا تھے۔ یہاں تک کہ سکندر اعظم کا باپ

فیلبوس پیدا ہوا اور اس نے ان پر اپنی شخصی حکومت قائم کر لی لیکن اس کو اپنا اقتدار جمانے کیلئے جمہوریت سے بہت سے خوفناک مقابلے کرنے پڑے۔ ان مقابلوں میں عوام کی رہنمائی کی باگ یونان کے سب سے بڑے خطیب ڈیموس تھینیز کے ہاتھوں میں تھی۔ جب فیلبوس نے جمہوریت کو شکست دیدی تو دارالسلطنت ایتھنز کے باشندوں کو تسلی دینے اور ان کی جانبازی اور حریت پرستی کی تعریف کرنے کے لئے ڈیموس تھینیز نے ایک مشہور تاریخی تقریر کی۔ اس میں اس نے اپنے حریف اسکی نس کے دلائل کی جو بادشاہ کا حامی تھا، پرزور تردید کی ہے۔ اس تقریر کے بعض فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

> "اے اہل ایتھنز! جس وقت کہ تم نے یونان کی آزادی و حفاظت کی راہ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈالیں تو تم باطل پر نہیں تھے۔ اس کے لئے تمہارے اسلاف کی زندگی تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔ اور یقیناً وہ باطل پر نہیں تھے۔ تمہارے وہ اسلاف جنھوں نے ماراتھون کے معرکہ میں جانبازی کے جوہر دکھائے، جنھوں نے سلامیس کی لڑائی میں اپنی گردنیں کٹوائیں۔ جنھوں نے پلاتیہ کے مورچہ پر سرفروشیاں کیں، وہ باطل پر نہیں تھے۔ ہرگز باطل پر نہیں تھے!!! ان جانبازوں کی قسم جنھوں نے ماراتھون کے معرکہ میں اپنی جانیں جوکھم میں ڈالیں، ان سرفروشوں کی قسم جو سالامیس اور ارتمیسیم کی بحری جنگ میں شریک تھے، ان سورماؤں کی قسم جنھوں نے پلاتیہ میں دشمن کا مردانہ وار مقابلہ کیا!!! اے اسکینس! اہل ایتھنز نے اس وقت صرف انہی کی عزت نہیں کی جو میدان جنگ سے کامیاب واپس آئے بلکہ انکی لاشوں کا بھی یکساں احترام کیا جنھوں نے بہادرانہ اپنی گردنیں کٹوا دیں۔"

یعنی پبلک کی طرف سے احترام و اعزاز ان کی کامیابی پر نہیں ہوا بلکہ محض جانبازی اور سرفروشی پر ہوا۔ اسی طرح آج تم اگرچہ کامیاب نہیں ہو سکے لیکن تمہارے اعزاز کے لئے یہ بس ہے کہ

تم نے آزادیٔ وطن کی راہ میں اپنی گردنیں کٹوائیں۔

ڈیموس تھینیز کی اس قسم پر غور کرو اس نے حاضرین کے سامنے کس طرح ان کے اسلاف اور ان کے پرفخر کارناموں کو لاکر کھڑا کر دیا ہے تاکہ ہر سننے والے کا دل جوش اور فخر سے معمور ہوجائے اور پھر ان کے کارناموں کو مخاطب جماعت کی ناکام مگر جانبازانہ جدوجہد کی صحت و صداقت پر دلیل ٹھہرا دیا ہے۔ اور کلام کا اسلوب اس قسم کا ہے جو تاکید و توثیق کے لئے آتی ہے۔ اس قسم کی بلاغت پر ڈیموستھینیز کے تمام ناقدین کا اتفاق ہے لیکن جس طرح ہمارے علمائے متاخرین اس طرح کے اسالیب بلاغت سے آہستہ آہستہ ناآشنا ہوگئے اسی طرح یونان کے علمائے متاخرین بھی ان چیزوں کے ذوق سے محروم ہوگئے۔ چنانچہ لانجنوس، جو ڈیموس تھینیز کے چھ سو برس بعد پیدا ہوا اور ایتھنز میں بلاغت کا معلم اور سرآمد روزگار تھا اپنی فن بلاغت کی کتاب میں اس قسم کا ذکر کرتا ہے اور اسکی ساری خوبی اور بلاغت کا راز یہ بتاتا ہے کہ اس میں مقسم بہ کی غایت درجہ تعظیم ہے۔ گویا ڈیموس تھینیز نے قوم کے اسلاف کو معبودوں کی حیثیت دیکر انکی قسم کھائی ہے۔

لانجنوس کو اس قسم کے بارہ میں ان لوگوں کی رائے سے اختلاف ہے جو کہتے ہیں کہ اس قسم میں وہ اسلوب ملحوظ ہے جو یوپلیوس شاعر نے اپنے تاج کی قسم میں ملحوظ رکھا ہے۔ ہم یہاں یوپلیوس کی قسم کی بھی تفصیل کر دیتے ہیں تاکہ ہمارے دعویٰ کا ایک عمدہ ثبوت بھی سامنے آجائے اور یہ امر بھی واضح ہوجائے کہ ڈیموس تھینیز کی قسم کے بارہ میں صحیح رائے وہی ہے جس کو قبول کرنے سے لانجنوس کو انکار ہے۔

قسم بطور استدلال بولیوس کے کلام میں

اہل یونان کا، اپنی حریت و آزادی کے زمانہ میں، یہ دستور تھا کہ جب ان میں سے کوئی شخص کوئی بڑا کارنامہ انجام دیتا تو بطور اعزاز و تکریم اس کے سر پہ تاج رکھتے۔ مارتھون کے معرکہ میں مشہور یونانی شاعر بولیوس نے ایسے جوہر دکھائے کہ اہل ملک کی طرف سے وہ بھی اس عزت کا مستحق ٹھہرا لیکن اس کے بعض حاسدوں نے لوگوں کے دلوں سے اسکی وقعت کم کرنے کے لئے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ وہ قوم کا دشمن ہے۔ اس تہمت کی تردید میں اس نے ایک نظم لکھی جس کے دو شعروں کا ترجمہ یہ ہے۔

> "نہیں، اپنے سر کے اس تاج کی قسم جو مارتھون کے معرکہ کے موقع پر میں نے پایا۔
> میرا کوئی حاسد یہ نہیں بتا سکتا کہ میں اپنی قوم کے لئے اپنے دل میں کوئی عداوت چھپائے
>
> ہوئے ہوں"

اس نے اپنی قوم کے ہاتھوں جو تاج پایا ہے اسی کو اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ وہ اپنی قوم کا دشمن نہیں ہو سکتا، گویا اس کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس قوم نے ایسی عظیم الشان عزت سے اس کو سرفراز کیا ہے اس قوم کے خلاف وہ اپنے دل میں کسی عداوت کو کیسے جگہ دے سکتا ہے!

غرض جس طرح کہ بعض دوسری مثالوں میں ہم دیکھ چکے ہیں، اس مثال سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قسم صرف معبودوں اور دیوتاؤں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اور اسی سے ایک طرف تو وہ بنیاد بالکل ڈھے جاتی ہے جس پر لامنس نے اپنی عمارت قائم کی ہے۔ اور دوسری طرف ان لوگوں کی تائید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ

ذیوس مجینزا ادر بولیوس دونوں کی قسمیں بالکل یکساں نوعیت کی ہیں اور ان کا مقصد استدلال ہے نہ کہ محض مقسم بہ کی تعظیم۔ اگر مقسم بہ قابل تعظیم ہے تو یہ بالکل اتفاق کی بات ہے نفس قسم کو اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعینہ یہی بات ہم نے اوپر عروہ بن مرہ کے شعر میں دیکھی ہے جو گیارہویں فصل میں گذر چکا ہے اس نے مرغ کی قسم کھائی ہے اور مقصود اس کو ضعف اور ذلت کی مثال کی حیثیت سے پیش کرنا ہے۔

(باقی)

تفسیر سورۃ الفیل

اس کتاب کی ہر فصل ایک مستقل کتاب ہے واقعہ فیل کی اصلی حقیقت اس کتاب کی اشاعت سے پہلے بالکل مجہول تھی جس سے سورہ کی تفسیر میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ مولانا نے کلام عرب کی مدد سے واقعہ کی تمام تفصیلات فراہم کرکے تمام تاریخی غلطیوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ واقعہ طیر کو بھی عجائب پرستی نے بالکل دوسرا رنگ دیدیا تھا۔ مولانا نے اس واقعہ کے متعلق بھی عینی شاہدوں کی شہادتیں جمع کرکے اس کی اصل حقیقت آشکارا کر دی ہے اور اسی سلسلہ میں رمی جمرات اور حج کے دوسرے مراسم کے اسرار و حکم نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمائے ہیں، کتابت و طباعت بہترین، کاغذ عمدہ۔ قیمت اردو ۸ر- عربی ۸ر

منیجر

مذاکرہ

ہمارے علماء کے فقہی اختلافات

(۳)

اہل حدیث اور اصحاب رائے ہمارے فقہ کے مختلف اسکول درجہ بدرجہ جس طرح قائم ہوئے اور ان میں جس قسم کا اختلاف جن اسباب سے پیدا ہوا اس کو بالاجمال سمجھنے کیلئے اوپر کے اشارات کافی ہیں۔ لیکن ابھی اہل حدیث اور اصحاب رائے (فقہ) کے اختلاف کی نوعیت معلوم کرنا باقی ہے اور مناسب ہے کہ چند سطروں میں اس نزاع کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے۔

معاملہ کو بالاجمال سمجھنے کے لئے یہ بات جاننی کافی ہے کہ جو اسباب مالکی اور حنفی مذاہب کے ہوتے ہوئے شافعی مذہب کے قیام کے باعث ہوئے بعینہ وہی اسباب ان تینوں مذاہب کے ہوتے ہوئے اہل حدیث کے مذہب کے قیام کے باعث ہوئے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ سلف میں یہ بات بالکل متفق علیہ تھی کہ جب تک سنت رسولؐ کسی باب میں موجود ہو اس وقت تک اجتہاد و رائے کو دین میں دخل نہ دیا جائے چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے متعلق روایت ہے کہ جب ان سے کسی معاملہ میں سوال کیا جاتا تو فرماتے کہ میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ تمھارے لئے کوئی ایسی چیز حلال کر دوں جو اللہ نے حرام کی ہو یا کوئی ایسی چیز حرام

کروں جو اللہ تعالیٰ نے حلال کی ہو۔ حضرت معاذ بن جبلؓ فرمایا کرتے تھے کہ کسی معاملہ کیلئے اس کے پیش آنے سے پہلے جلدی نہ کرو (یعنی فرضی صورتوں کے لئے نہ فتوے پوچھو نہ فتوے دو) مسلمانوں میں ایسے لوگ برابر رہیں گے۔ جو پیش آنے والی صورتوں کے لئے شریعت کی ٹھیک راہ پالیں گے۔ حضرت ابن عمرؓ نے جابر بن زید سے کہا کہ صرف قرآن ناطق اور سنت کے مطابق فتوے دو اگر اس راہ سے ہٹے تو ھلکت واھلکت خود ہلاک ہوگے اور دوسروں کو ہلاک کروگے۔ ابوسلمہ نے حضرت حسن سے کہا مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ آپ اپنی رائے سے فتوے دیتے ہیں، ایسا نہ کیجئے ہمیشہ سنت رسول اور کتاب اللہ کے مطابق فتوے دیجئے۔ ابن منکدر سے روایت ہے کہ عالم اللہ اور اس کے بندوں کے بیچ میں دخل دیتا ہے پس اس کو اپنے لئے راہ تلاش کر رکھنی چاہئے۔ شعبی سے پوچھا گیا کہ جب آپ لوگوں کے سامنے کوئی صورت مسؤلہ پیش کی جاتی تو آپ لوگ کیا کرتے تھے؟ انھوں نے فرمایا تم نے جاننے والے سے بات پوچھی۔ ہم میں سے جب کسی سے کوئی بات پوچھی جاتی تو وہ اپنے ساتھی کی طرف جواب کے لئے اشارہ کرتا، وہ دوسرے ساتھی کی طرف، یہاں تک کہ معاملہ پھر پھرا کے پہلے ہی کی طرف لوٹ جاتا۔

یہ روایات وآثار دارمی میں موجود ہیں، اور ان کے امثال وشواہد بکثرت جمع کئے جاسکتے ہیں لیکن اصل مدعا کو واضح کرنے کے لئے یہ کافی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سلف فتوی دینے میں نہایت احتیاط و تورع سے کام لیتے تھے اور اس احتیاط و تورع کی وجہ محض تقوی اور کسر نفس نہیں تھا بلکہ اس امر کا اہتمام تھا کہ قانون الٰہی کی وحدت وحاکمیت میں کسی قسم کی دراندازی نہ ہو۔ اس لئے وہ برابر اس کیلئے

ساعی رہتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو ہر باب میں کتاب اللہ و سنت رسول سے تمسک کیا جائے۔ چنانچہ اسی سنت رسول کی طلب تھی جس نے حضرت امام شافعی کو آمادہ کیا کہ وہ مالکی اور حنفی اسکول کے اجتہادات پر قانع نہ ہوں بلکہ احادیث و آثار کا جو ذخیرہ ظاہر ہو رہا ہے اس سے فائدہ اٹھائیں اور یہی سرگرمی اور طلب تھی جو ایک جماعت کے اندر برابر باقی رہی اور اس نے حجاز، شام، عراق، مصر، یمن اور خراسان وغیرہ کے گوشہ گوشہ کو چھان کر احادیث و آثار کو فراہم کیا۔ ان کی تحقیق و تنقید کی، ان کی غرابت و شہرت کے درجے قائم کئے۔ یہاں تک کہ اس جماعت کے پاس احادیث و آثار کا جو ذخیرہ جمع ہو گیا اس سے پہلے کسی جماعت کے پاس جمع نہ ہوا۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

اس مقدس جماعت کے اکابر عبد الرحمٰن بن مہدی، یحییٰ قطان، یزید بن ہارون، عبد الرزاق، ابوبکر بن ابی شیبہ، مسدد، ہناد، احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ، فضل بن دکین، اور علی مدینی وغیرہ ہیں۔

ان اکابر نے فن روایت اور مراتب حدیث کو استوار کر لینے کے بعد فقہ کی طرف توجہ فرمائی۔ اس باب میں ان کے ہاں بنیادی اصول یہ قرار پایا کہ فقہ کے مذاہب سابقہ میں سے کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جو بعض مسائل میں احادیث و آثار سے تناقض نہ رکھتا ہو پس کسی ایک متعین شخص کی تقلید صحیح نہیں ہے چنانچہ یہ حضرات ہر حالت کے لئے احادیث نبویؐ اور آثار صحابہؓ و تابعین و مجتہدین کی رہنمائی تلاش کرتے تھے اور اس کے لئے ان کے سامنے ایک خاص ضابطہ تھا جس کے بنیادی اصول شاہ صاحب کے بیان کے مطابق یہ ہیں۔

۱- جس معاملہ میں قرآن ناطق موجود ہو اس میں اس سے کسی حال میں ہٹنا جائز نہیں۔

۲- اگر قرآن مختلف پہلوؤں کو محتمل ہو تو فیصلہ کرنے والی چیز سنت ہے۔

۳- جس باب میں کتاب اللہ خاموش ہو اس میں سنت رسول اللہ کی پیروی کی جائے۔ خواہ یہ سنت فقہا اور علما کے درمیان شہرت رکھتی ہو۔ یا کسی خاص شہر، کسی خاص خاندان اور کسی خاص طریق کے ساتھ اختصاص رکھتی ہو۔ نیز صحابہ اور فقہا نے اس پر عمل کیا ہو یا نہ عمل کیا ہو۔

۴- جس مسئلہ میں حدیث موجود ہو اس میں اس کے خلاف کسی اثر اور اجتہاد کی پیروی نہ کی جائے۔

۵. تتبع کے باوجود اگر کسی مسئلہ میں حدیث نہ ملے تو اس میں صحابہ و تابعین کے قول کی بلا اختصاص قوم و بلد پیروی کی جائے۔ اگر ایک رائے پر جمہور خلفاء اور فقہا متفق ہوں تو وہ سب پر مقدم ہے اور اگر ان میں اختلاف ہو تو اس کا مسلک لیا جائے جو سب سے زیادہ اعلم اور متقی ہو اور اگر اس پہلو سے دو مسلک بالکل مساوی درجہ کے ہوں تو دونوں قول لائق اختیار ہیں۔

۶- اگر ان سب صورتوں میں سے کوئی صورت میسر نہ ہو تو کتاب و سنت کے عموم اور ان کے اشارہ و اقتضاء کی روشنی میں کوئی اوفق بات معلوم کی جائے اور اس کی پیروی کی جائے۔

حق یہ ہے کہ یہ اصول نہایت صحیح اور مزاج شرع سے نہایت اوفق ہیں اور ان میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جن سے سلف کی کسی جماعت کو اختلاف ہو بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سب کے اصول یہی تھے البتہ یہ بات ضرور تھی کہ ارباب افتاء و قضاء نے

ضرورت کی بنا پر اکثر حالات میں محض اپنے شہر کی روایات و آثار یا اپنے علماء و شیوخ کے اجتہادات کی بنا پر فتوے دے دیئے اور روایات و آثار کی تلاش میں وہ سرگرمی صرف نہیں کی جو علمائے حدیث نے صرف کی لیکن ظاہر ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کے لحاظ سے ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ فتوے اور قضا کے معاملات فوری توجہ کے محتاج ہوتے ہیں، تفتیش و جستجو کے انتظار میں عدالتوں کا کاروبار اور روز پیش آنے والی ضروریات کا منہ بند نہیں کیا جا سکتا۔ پس ان کے لئے وہی راہ صحیح تھی جو انھوں نے اختیار کی یعنی جن صورتوں کے لئے ان کے سامنے کتاب و سنت کی کوئی تصریح موجود نہیں ہوئی انھوں نے اجتہاد و رائے سے کام لیا مگر اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ آیندہ اگر ان مسائل کے متعلق صحیح روایات مل جائیں تب بھی یہی اجتہاد و رائے قائم رہے۔ دین کے معاملہ میں اس قسم کی جرأت کا ان اسلاف کی نسبت سوءِ ظن نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ بات بالتحقیق معلوم ہے کہ اسلاف صحیح روایات کے مقابل میں ہمیشہ اپنے اجتہادات سے رجوع کرتے تھے۔

لیکن افسوس ہے کہ بعد میں آہستہ آہستہ شہر شہر کی فقہ اور اپنے اپنے علما کی حمایت کا جذبہ زیادہ زور پکڑتا گیا۔ شروع شروع میں جو بات محض ایک شرعی ضرورت، احتیاط، اعتماد کے خیال سے تھی بعد میں اس نے ایک فتنہ کی حیثیت اختیار کر لی اور دین مختلف حصوں میں بٹ گیا حالانکہ صحیح راہ یہی تھی کہ جس رفتار کے ساتھ درجہ بدرجہ محدثین کی سعی سے روایات و آثار کی تفتیش و تحقیق اور ان کی بحث و تنقید کا معاملہ آگے بڑھتا اسی رفتار کے ساتھ ہمارے فقہا کے اجتہادات ان کا ساتھ دیتے اور جو اجتہادات ایسے ہوتے جو صحیح روایات سے متصادم ہوتے، [illegible]

وہ اپنی جگہ اپنے سے بہتر یعنی صحیح تر روایت کے لئے خالی کر دیتے لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ چونکہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سے مسلمانوں کا صحیح شرعی نظام بالکل درہم برہم ہو گیا اور مرکز میں کوئی ایسی دینی رہنمائی باقی نہیں رہ گئی جو اختلافات کو مٹانے اور فکر و اجتہاد اور تحقیق و تفتیش کی تمام قوتوں میں ایک عضوی تالیف پیدا کرکے ان کے کاموں میں وحدت و ہم آہنگی پیدا کرے اس لئے جو رخنہ پیدا ہوا وہ روز بروز بڑھتا گیا اور یہ سب سے بڑی آفت ہے جو خیر القرون کے انقراض کے بعد امت پر نازل ہوئی ۔

بہرحال جو طلب امام شافعیؒ کو، مالکی اور حنفی مذہب کی قائم کردہ حدود سے آگے کھینچ لائی وہی جستجو اہل حدیث کو کچھ اور آگے کھینچ لائی اور یہ دونوں اسکول پچھلے دونوں اسکولوں سے، اور یہ موخر الذکر اسکول ماسبق تینوں اسکولوں سے الگ ہو گیا۔ اور گو حقیقت کے اعتبار سے ان میں باہمدگر کوئی ایسا بنیادی اختلاف نہیں لیکن امتداد زمانہ نے اب ان کے باہمی اختلافات کو ایسا راسخ اور بعد والوں کی تنگ نظریوں نے ان کو ایسا خوفناک بنا دیا کہ علما اور عوام سب نے طے کر لیا کہ یہ اختلافات قیامت سے پہلے نہیں مٹ سکتے۔

شروع شروع میں اپنے اپنے دیار و امصار کے علما و شیوخ کے ساتھ جو اعتنا تھا اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ وہی چیز بعد میں بڑھتی گئی یہاں تک کہ تخریج اور پھر تخریج در تخریج کے اصول نے دین میں جگہ پکڑی اور مجتہدین فی المذہب پیدا ہوئے جن کے لئے یہ بات کافی تھی کہ وہ اپنے ائمہ کی کتابوں اور ان کے مجتہدات و فتاوی کو یاد رکھیں اور جب ان کے سامنے کوئی صورت پیش آئے تو ذخیرہ محفوظہ کی جزئیات سے اور اگر نہ

صورت ممکن نہ ہو تو اس کے عموم و اقتضاء کی روشنی میں القول المخرج علی مذہب فلاں کہہ کر سائل پر دین کی حجت تمام کردیں۔ اور آہستہ آہستہ اس چیز نے اتنی وسعت پکڑی کہ کتاب و سنت دین کے مصدر محض عالم خیال میں رہ گئے۔ چنانچہ یہ بات بطور ایک اصل کے تسلیم کرلی گئی کہ من حفظ المسوط کان مجتہدا (جو مبسوط کا حافظ ہو وہ مجتہد ہے اگرچہ اس کو ایک روایت و حدیث سے بھی واقفیت نہ ہو۔

دوسری طرف محدثین کو اپنے اصولوں کی پاسداری میں (جو یقیناً منصوص نہ تھے بلکہ ائمہ حدیث کے اپنے ٹھہرائے ہوئے تھے) اتنا غلو اور تشدد ہوا کہ تخریج تو درکنار روایت کے اخذ و قبول میں انھوں نے بسا اوقات انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ ابن حزم نے ارسال و انقطاع کے معمولی شائبہ کی بنا پر بہت سی روایات رد کردیں۔ اسی طرح اگر کسی راوی کی نسبت طے کرلیا گیا کہ وہ فلاں کی حدیثوں کا سب سے زیادہ محفوظ واسطہ ہے تو پھر اس کے علاوہ دوسرے واسطہ میں ہزار وجہ ترجیح موجود ہو لیکن وہ لائق قبول نہیں۔

غرض ایک طرف تخریج سے گویا بالکلیہ انکار اور دوسری طرف تخریج کا یہ زور کہ اس کے سامنے صاف اور صریح روایات بالکل ہیچ۔ حالانکہ انصاف، جیسا کہ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا ہے، یہ ہے کہ دین میں ان دونوں کی جگہ ہے اور ان میں سے کسی سے بھی بے پروائی ممکن نہیں ہے، نہ غلو کے ساتھ رد و انکار کی راہ صحیح ہے اور نہ مبالغہ کے ساتھ اختیار و قبول کی۔ ٹھیک راہ یہ ہے کہ ایک کے نقص کی دوسرے سے تلافی کی جائے۔ ارباب حدیث اپنے مختارات کو ائمہ مجتہدین تابعین کی رایوں سے جانچیں اور اہل تخریج سنن و آثار کا ایسا اہتمام کریں کہ کسی حدیث صحیح کی مخالفت

کی ذمہ داری ان پر عائد نہ ہو۔ اسی طرح ارباب حدیث اپنے ائمہ کے قرار دادہ اصول کی حمایت میں اس قدر تعمق کو راہ نہ دیں کہ خود حدیث صحیح یا قیاس صحیح اس کی زد میں آجائے۔ اس طرح جب ہر طرف سے افراط و تفریط کے کج پیچ نکل جائیں گے تو آپ سے آپ ایک معتدل اور متفق علیہ صورت سب کو جمع کر دینے والی نکل آئے گی۔

اس اختلاف و نزاع کے دوراہے میں بیچ کی حد ابو سلیمان خطابی نے متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے معالم السنن سے اس کا خلاصہ نقل کیا ہے ہم اس کے ضروری اقتباسات یہاں پیش کرتے ہیں۔

"ہمارے زمانہ کے اہل علم دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ (۱) اصحاب حدیث واثر (۲) اور ارباب فقہ و نظر۔ اور باعتبار ضرورت و اہمیت ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے فروتر نہیں ہے کیونکہ حدیث بمنزلہ اساس کے ہے اور فقہ بمنزلہ عمارت کے اور معلوم ہے کہ جس عمارت کی تعمیر کسی بنیاد پر نہ ہو وہ گر جائیگی اور اسی طرح جو بنیاد عمارت سے محروم ہو وہ محض ایک ویرانہ ہے۔"

دونوں کی قدر و منزلت اور ضرورت و اہمیت کے اعتراف اور ان کے باہمی اتفاق و اتحاد کی تمنا ظاہر کرنے کے بعد دونوں کے عیوب کو ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے۔

"یہ طبقہ یعنی اہل حدیث تو ان میں اکثر کی ساری جد و جہد کا منتہا جمع حدیث ہے اور اس میں وہ غریب و شاذ کو بھی جمع کرتے ہیں جنکا بڑا حصہ بالکل موضوع یا مقلوب ہوتا ہے۔ یہ نہ متن کا اہتمام کرتے نہ ان کے معانی و اسرار اور حقایق سمجھنے کی کوشش کرتے اور اکثر فقہا پر اعتراض و نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں اور ان پر سنت کی مخالفت کا الزام عائد کرتے ہیں اور بالکل نہیں جانتے ہیں کہ یہ لوگ ان کے مبلغ علم سے

محروم ہیں اور ان کو برا بھلا کہہ کر اپنے کو گنہگار کرتے ہیں"

فقہائے کرام کی غفلت و مسامحت کا ان لفظوں میں ذکر کیا ہے۔

" رہا دوسرا طبقہ یعنی اربابِ فقہ و نظر کا تو یہ لوگ حدیثوں کی طرف بہت کم التفات کرتے ہیں اور ان کے صحیح و سقیم میں امتیاز کی کوشش نہیں کرتے۔ جو حدیثیں ان کو پہنچی ہیں اگر وہ ان کے خیالات و معتقدات کے موافق ہیں تو ان سے اپنے حریفوں کے خلاف حجت لانے میں بڑا اہتمام ہیں کرتے بلکہ حدیث ضعیف و منقطع کے قبول کرنے میں ان حضرات نے ایک قسم کی مداہنت پر ایکا کر لیا ہے بشرطیکہ وہ حدیث ان کے درمیان شہرت پکڑ جائے اور انکی زبانوں پر چڑھ جائے۔ ہرچند اس کا ذریعہ کتنی ہی ناقابل اعتماد و وثوق ہو، اور راوی کی لغزش اور عجز کا کتنا ہی احتمال ہو۔ حالانکہ ان حضرات سے اگر خود ان کے ائمہ کے کسی اجتہاد کی بات روایت کیجائے تو گو وہ مسئلہ بالکل اجتہادی ہو گا لیکن اس میں راوی کی ثقاہت کا سوال پیدا کرینگے۔ اصحاب مالک اپنے مذہب کے باب میں صرف ابن قاسم اور اشہب اور ان جیسے اکابر اصحاب کی روایت پر اعتماد کرتے ہیں۔ اگر کوئی روایت ان کے سامنے عبداللہ بن عبدالحکیم وغیرہ کے واسطے سے آئے تو اس کو ہرگز لائق اعتماد نہ خیال کریں گے۔ اسی طرح اصحاب ابو حنیفہ کا تمام تر اعتماد قاضی ابو یوسف اور محمد بن حسن اور ان جیسے اکابر اصحاب کی روایت پر ہے، اگر کوئی روایت حسن بن زیاد لولوئی وغیرہ کے واسطے سے ان بزرگوں کے خلاف پیش کی جائے تو اس کو ہرگز باور نہیں کریں گے۔ یہی حال امام شافعی کے اصحاب کا ہے۔ اپنے مذہب کے باب میں ان حضرات کا تمام تر اعتماد مزنی اور ربیع بن سلیمان مرادی کی روایات پر ہے"

> اگر خزیمہ اور حیری وغیرہ سے کوئی روایت کی جائے تو اس کو ہرگز نہ تسلیم کرینگے۔ یہی حال تمام ائمہ کے اصحاب کا ہے کوئی بھی اپنے مذہب کے بارے میں کوئی روایت قبول کرنے میں مداہنت اور سہل انگاری سے کام نہیں لیتا مگر جب اپنے شیوخ سے روایت کرنے میں ان کے اہتمام کا یہ حال ہے اور فروع کے لئے یہ لوگ اس درجہ چھان بین کرتے ہیں تو حیرت ہے کہ یہ حضرات ایک اہم ترین اور عظیم ترین معاملہ میں تساہل کو کیوں راہ دیتے ہیں اور ان کے لئے یہ بات کیسے جائز ہو سکتی ہے کہ امام الائمہ، رسول رب العزت سے نقل و روایت کے بارہ میں بے پروائی سے کام لیں حالانکہ ان کے ہر حکم کی اطاعت ہم پر واجب اور ہر امر کی فرمانبرداری ہم پر لازم ہے۔" .... "اگر ایک شخص اپنے معاملہ میں تساہل سے کام لے اور اپنے قرضداروں سے کھرے کھوٹے ہر طرح کے سکے قبول کرے اور ان کے عیب سے چشم پوشی کر جائے تو یہ ایک بات ہے لیکن جب وہ کسی ضعیف کا ولی، یتیم کا وصی اور غائب کا وکیل ہے تو ایسی حالت میں اس کی ادنیٰ بے پروائی بھی خیانت کے ہم معنی ہے ...."

اس کے بعد مصنف کے الفاظ تیز و تند ہو گئے ہیں اور جی نہیں چاہتا کہ ان کو پیش کیا جائے۔ مگر چونکہ بات بالکل سچی ہے اس لئے فائدہ سے خالی نہیں، وہ فرماتے ہیں۔

> "لیکن بعد میں ایسے لوگ آئے جن کو طلب حق کی راہ دشوار معلوم ہوئی اور انہوں نے راحت کو پسند کیا اور جلد بازی کو ترجیح دی اور علم کے راستہ کو مختصر کر کے وہ اصول فقہ کے چند الفاظ و حروف پر قانع ہو گئے۔ ان کا نام علل رکھ لیا اور علم کی نمائش کیلئے ان کو شعار اور حریفوں سے مناظرہ و مجادلہ کے لئے ان کو سپر بنایا۔ اب وہ انہی پر

لڑتے اور ایک دوسرے کا منہ نوچتے ہیں اور جو شخص اس کارزار سے کامیاب لوٹتا ہے وہی وقت کا ماہر، زمانہ کا فقیہ اور شہر کا سردار و امام پکارا جاتا ہے۔ شیطان نے ان کو اچھا حیلہ سوجھایا ہے اور ان سے خوب چال چلی ہے: "اس نے انکو سکھایا ہے کہ تمھارے علم کی پونجی تھوڑی ہے جو ضرورت کے لئے کسی طرح کفایت نہیں کرسکتی۔ پس کلام کی پناہ پکڑو اور متکلمین کے سلاح خانہ سے ہتھیار مستعار لو تاکہ خوض وجدل کی راہوں میں کامیاب رہو۔ فصدق علیھم ابلیس ظنه واطاعه کثیر منھم واتبعوه الا فریقا من المومنین فیا للرجال والعقول این یذھب بھم وانی یجد بھم الشیطان عن حظھم وموضع رشدھم والله المستعان"

(باقی)

تفسیر سورہ کوثر

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمتہ اللہ علیہ کی تفسیر سورہ کوثر کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں کوثر کی تحقیق، خانہ کعبہ کی روحانی حقیقت اور نماز اور قربانی کے اسرار و حقایق پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اصلی عظمت کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔ کتابت و طباعت و کاغذ عمدہ

قیمت اردو ۸ر عربی ۴ر

منیجر

NATIONAL MUSLIM
جامعہ ملیہ اسلامیہ
D

سورۂ تحریم اور ذبیح سے متعلق بعض شکوک

الاصلاح کے ایک قدرداں تحریر فرماتے ہیں۔

" السلام علیکم۔ سورۂ تحریم کے عرض ترقیم میں آنے سے قبل مضطر منتظر تھا کہ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ایسے عقدہ کو ضرور حل کیا ہوگا جس کے باعث عرصے سے دل منقبض رہا کرتا ہے۔ مگر تفسیر کو زیر مطالعہ لانے سے وہی نتیجہ نکلا کرع۔ اس لئے ملتمس ہوں کہ عریضہ ہذا کو اپنے رسالہ میں جگہ دیکر حسب ذیل مسائل میں رہبری فرماویں۔ استفسار طلب امور یہ ہیں۔

۱ ازواج النبی صلعم میں سے افشائے راز کی لغزش تو صرف ایک ہی حرم محترم سے سرزد ہوئی تھی۔ اور تائب ہونے کے لئے تہدید آمیز خطاب سے اسی بی بی کو گردانا تھا، مگر جس بی بی کے روبرو بھید کھولا گیا تھا، انھیں اس سرزنش میں شامل کرنے کی کیا وجہ ہو گئی، کیا اس بی بی نے افشائے راز کے لئے کوئی جبر کیا تھا۔ کہ وہ بھی زیر عتاب ہوئیں۔ بینوا توجروا۔

" ذبیح کون ہے" کا مضمون بھی الاصلاح نمبر ۳ و ۴ میں اختتام کو پہنچ گیا ہے۔ جسمیں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبیح ثابت کیا گیا ہے۔ نہ کہ اسحٰق کو جیسا کہ سورہ صٰفٰت سے بالکل صاف صاف عیاں ہے۔ نیز اس سلسلہ میں یہ بھی تحریر فرمایا گیا ہے کہ علمائے اسلام

میں سے جن صاحبوں نے حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبیح تسلیم کیا ہے، وہ ان کے عدمِ تعصب پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن جریر کا علانیہ ذبیح اسحٰقؑ کے مذہب کو ترجیح دینا اس کا نہایت واضح ثبوت ہے، مگر علامہ ابن جریر سے تو معدودے چند خاص خاص لوگ واقف ہوں گے اور گیارہویں والے حضرت پیران پیر رحمۃ اللہ علیہ کو تو اسلامی دنیا کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ انھوں نے بھی اپنی مشہور و معروف کتاب "فتوح الغیب" کے المقالۃ الخامسۃ والسبعون میں تحریر فرمایا ہے کہ التصوف مبنی علی ثمان خصال السخاء لابراہیم والرضاء لاسحٰق الصبر لایوب الاشارۃ لزکریا والغربۃ لیحیی ولبس الصوف لموسیٰ السیاحۃ لعیسیٰ الفقر لمحمد صلی اللہ علیہ وسلم وعلیہم اجمعین۔

چنانچہ مخطوط الفاظ سے غوث پاک کے اسی خیال کا انکشاف ہو رہا ہے۔ مرحوم علامہ صاحب فراہی تو اس امر کو علمائے اسلام کی بے تعصبی پر محمول کرتے ہیں، مگر میرے جیسا ایک بے علم انسان ان اسرائیلیات کو دینی حصہ میں مرکوز شدہ دیکھ کر علی الاعلان پکار اٹھتا ہے کہ ع ....

...... الاصلاح کے اسی نمبر میں علامہ صاحب نے سورہ تحریم کی تفسیر میں ابن عباس کی طرف منسوب کردہ روایات کو جھوٹی روایات سے تعبیر کیا ہے، کاش علامہ صاحب ان جھوٹی روایات کو سبائی روایات کہہ دیتے تو زیادہ موزوں ہوتا۔ دعا ہے کہ خدائے کریم! وہ دن جلد لائے کہ مسلمانانِ عالم اسلامی روایات اور سبائی روایات میں تمیز کرنے کے قابل ہو جائیں۔ امید ہے، ہمارے ان خیالات کو خام خیالی تصور نہ فرما کر آپ خامہ فرسائی کی تکلیف گوارہ کرنے سے دریغ نہ کریں گے۔

راقم احقر نور محمد سوز۔ کمالیہ ضلع لائل پور

الاصلاح ۔ غالباً پوری کتاب آپ کو اطمینان سے پڑھنے کی فرصت نہیں مل سکی ورنہ ان شکوک کے جوابات انہی صفحات کے اندر طبیعت خود بخود ڈھونڈ لیتی بہرحال چونکہ آپ کو جواب کے لئے اصرار ہے اور اس اصرار کے ساتھ آپنے اپنی ایک دیرینہ خواہش کا بھی حوالہ دیا ہے اس لئے مجبوراً چند امور کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

پہلے سوال کی نسبت خود مولاناؒ کی مندرجہ ذیل سطریں پیش نظر رکھئے ۔

''آنحضرت صلعم کے متعلق یہ بات معلوم ہے کہ جس طرح آپ اپنے صحابہؓ کے ساتھ تمام چھوٹے بڑے کاموں میں شریک ہوتے تھے اسی طرح گھر کے کام کاج میں ازواجؓ مطہرات کا بھی ہاتھ بٹاتے تھے اور اس خلق نبوی نے قدرۃً آپس میں انس و محبت کی ایک ایسی حالت پیدا کر دی تھی جس کو زیادہ سے زیادہ اعتماد کی حالت کہا جا سکتا ہے اس باہمی اعتماد کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب آنحضرت صلعم نے افشائے راز پر کسی قدر ناخوشی کا اظہار فرمایا اور کچھ کھنچے کھنچے سے ظاہر ہوئے تو ان دونوں بی بیوں پر یہ بات شاق گذری اور ان میں ایک طرح کا جذبہ غیرت و حمیت بھڑک اٹھا ہر چند کہ یہ جذبہ ہر محل و مقام میں محمود نہیں لیکن باعزت و شریف طبائع کے اندر یہ ایسا فطری جذبہ ہے کہ ایسے مواقع پر اس کا دبا رہنا نہایت مشکل ہے پس جیسا کہ میاں بیوی کی آپس کی زندگی میں عام طور پر ہوتا ہے یہ دونوں بیبیاں بھی آپ سے روٹھ گئیں۔ انھوں نے خیال کیا کہ یہ آپس کے بیچ کے تعلقات کا ایک معاملہ ہے جس میں ان کو اپنی خودداری کے اظہار کا پورا حق ہے اس کو دین سے کوئی لگاؤ نہیں ہے''

پھر کچھ آگے چل کر فرماتے ہیں۔

"پس اللہ تعالیٰ نے ان کو نصیحت فرمائی کہ پیغمبر کی دلبستگی تمہارے ساتھ ایک بالکل مختلف حالت رکھتی ہے۔ یہ اس کی طرف سے سراسر شفقت و مہربانی ہے۔ اس لئے اللہ کا رشتہ کیا کم ہے کہ وہ کسی اور رشتہ میں طمانیت ڈھونڈے۔ اسکی مجلس ہر وقت روح القدس مومنین صالحین اور ملٰئکہ سے معمور ہے پس تم اگر اس سے روٹھ جاؤ تو اس سے تمہارے ہی دل ہی اجڑ جائیں گے۔ اس کی بزم کی رونق پھیکی نہیں پڑ سکتی اور پھر واضح لفظوں میں بتا دیا کہ کسی امر معروف میں پیغمبر سے اعراض درحقیقت امر الٰہی سے اعراض کے ہم معنی ہے اسلئے ضرور ہے کہ تم توبہ کرو۔"

پھر اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

"پھر پانچویں آیت نے اس دینی شرف و تقویٰ سے تعرض کیا ہے جس کا احساس ان دونوں بیبیوں کو ہو سکتا تھا اور وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کے اہل بیت خود چنے ہیں اور اپنے فضل و حکمت سے ان کو عمدہ اخلاق سے آراستہ فرمایا ہے چنانچہ فرمایا ہے الطیبٰت للطیبین والطیبون للطیبٰت نیز فرمایا ہے انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھرکم تطھیرا پس ان کو حق نہیں ہے کہ اپنے فضائل پر فخر کریں۔ یہ روشنی جو ان کو حاصل ہے نبی کے فیض صحبت سے حاصل ہے ۔۔۔۔ ۔۔ ۔۔"

ان سطروں کو بغور ملاحظہ فرمائیے ان سے معاملہ کی اصلی صورت سامنے آجائیگی۔ ان میں مصنف نے صاف صاف ظاہر کر دیا ہے کہ مطالبہ توبہ میں دوسری بی بی کو شریک کرنے کی وجہ کیا ہے! اصل یہ ہے کہ توبہ کے مطالبہ کی وجہ محض افشائے راز نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جب آنحضرت صلعم نے اس افشائے راز پر

گرفت فرمائی تو یہ بات ان دونوں بی بیوں پر شاق گذری اور ان میں غیرت وحمیت کا جذبہ بھڑک اٹھا۔ انھوں نے خیال فرمایا کہ یہ آپس کے تعلقات کی ایک بات ہے اس میں ان کو اپنی خودداری کے اظہار کا پورا حق ہے۔ گو یہ احساس روحی فطرت اور عایت اعتماد و محبت کا نتیجہ تھا اور اس کا ابھار ایک پاکیزہ سرچشمہ سے ہوا تھا لیکن جیسا کہ مصنفؒ نے ظاہر فرمایا ہے، صحیح نہیں تھا، پس ضروری ہوا کہ دونوں بیبیاں توبہ میں شریک ہوں اور اس غلط خودداری کی آلایش سے اپنے دلوں کو پاک کر کے ان کو صرف پیغمبر کی اطاعت و محبت کے لئے خالص کریں جس کے لئے وہ بہترین طریقہ پر اہل بھی ہیں اور اسی کے لئے خدا نے ان کو چنا بھی ہے۔

غالباً معاملہ کا یہ پہلو آپ سے مخفی نہ ہوگا کہ جب افشائے راز کے معاملہ پر آنحضرتؐ نے گرفت فرمائی ہوگی تو یہ بات دوسری بی بی پر نسبۃً زیادہ شاق گذری ہوگی۔ انسان فطری طور پر ایسے مواقع میں ایک قسم کی ہتک کا احساس کرتا ہے۔ وہ اصل معاملہ سے زیادہ اپنے نفس کی اہمیت کو محسوس کرتا ہے۔ اس کو یہ بدگمانی ہو جاتی ہے کہ اس معاملہ کو نفس معاملہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس کی ذات کی وجہ سے قابل اعتراض سمجھا گیا ہے، حالانکہ فی الحقیقت بات یہ نہیں ہوتی۔ پس ممکن ہے کہ دوسری بی بی کو یہ خیال گذرا ہو کہ آنحضرتؐ کو اس افشائے راز پر اس لئے اعتراض ہوا ہے کہ یہ افشائے راز ان کے سامنے کیوں ہوا؟ اس خیال کے ساتھ ان میں غیرت و خودداری کے جذبہ کا بھڑکنا ناگزیر تھا۔ اور یہی چیز باعث ہوئی کہ وہ بھی مطالبہ توبہ میں شریک کی جائیں۔

مصنفؒ نے اس معاملہ کو یہاں اس سے زیادہ پھیلانا ضروری نہیں سمجھا کہ محل و مقام اس سے زیادہ تشریح کا طالب نہیں تھا لیکن اگر آپ غور کرنا چاہتے ہیں تو ایک

دوسرے پہلو سے بھی اس پر غور فرمایئے۔

یہ سورہ جیسا کہ مصنفؒ نے تفصیل کے ساتھ ظاہر کیا ہے احتساب کی سورت ہے۔ اس میں تعلیم دی گئی ہے کہ ہر شخص اپنا، اپنے اعزا و اقربا اور اپنے دوستوں اور عزیزوں سب کا احتساب کرتا رہے۔ دین کے معاملہ میں کسی قسم کی چشم پوشی اور مداہنت کو راہ نہ دے ورنہ یہ چیز مذہب و اخلاق کی بربادی اور دنیا و آخرت کی رسوائی کا باعث ہوگی۔ اس روشنی میں معاملہ پر غور کیجئے تو ایک نئی حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ جس طرح ایک محرم راز کا فرض ہے کہ وہ کسی کے راز کو ظاہر نہ کرے کہ المستشار موتمن اسی طرح اس شخص کا جس کے سامنے راز ظاہر کیا جائے (خواہ وہ کیسے ہی اعتماد و اخلاص کی بنا پر ظاہر کیا جائے) یہ فرض ہے کہ وہ اس راز کو محض ایک تحفۂ محبت سمجھکر قبول نہ کرلے بلکہ راز ظاہر کرنے والے کے تمام اعتماد و محبت سے زیادہ فرض مذہبی و اخلاقی کو سامنے رکھکر اس کی اس کمزوری پر نکیر کرے، اور نصح کا فرض انجام دے جو دین میں ایک اصل راسخ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جو احتساب کی اصلی باطنی حقیقت ہے۔

لیکن جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہے۔ ایسے مواقع پر انسان بالعموم کمزور ہو جاتا ہے، کہ ایک شخص نے محض بربنائے محبت و اخلاص اس کے سامنے ایک شخص کا راز کھولا ہے تو اس کی محبت کی ناقدری کیوں کرے۔ وہ اس میں اپنے نفس کے لئے ایک عزت کی بو محسوس کرتا ہے اور اس مہک سے اتنا سرشار ہو جاتا ہے کہ اسے بالکل بھول جاتا ہے، کہ اس کے پندار نفس کا یہ صنم خانہ درحقیقت ایک بنیادی نیکی کو ڈھا کر بنا ہے۔

میں نے آپ کے سامنے معاملہ کو واضح کرنے کے لئے کچھ زیادہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ آپ ان سے الگ ہو کر زیر بحث معاملہ پر غور کیجئے کہ جن بی بی کے سامنے اظہار راز

کیا گیا تھا ان کا فرض کیا تھا؟ ان کا فرض یہ تھا کہ وہ محض اعتماد و محبت کی ایک سوغات سمجھ کر اس راز کو قبول نہ کر لیتیں بلکہ اس بات پر دھیان کرتیں کہ ان بی بی سے محض بر بنائے اخلاص ایک کمزوری صادر ہو رہی ہے کہ وہ شوہر کے راز کو (جو شوہر ہی نہیں بلکہ پیغمبر بھی ہے علیہ الف الف تحیہ) ظاہر کر رہی ہیں اور ان کی اس غلطی پر ان کو ٹوکتیں اور نصیحت کرتیں۔ لیکن وہ محبت و اعتماد کے مقابل میں یہ احتساب و سخت گیری کا طرز عمل نہ اختیار کر سکیں اور معاملہ کی اصلی نوعیت ان کے سامنے نہیں آئی۔ پس ضروری ہوا کہ یہ سورہ، جو تزکیہ و احتساب کی سورہ ہے، اور جس میں احتساب کا آغاز اہل بیت اطہار سے ہوا ہے، اس کمزوری پر بھی گرفت کی جائے جس کا مصدر گو ایک خوئے حسن ہے لیکن جو رہبانیت کے مانند انسان کو غلط راہ پر ڈالنے والی ہے۔ چنانچہ توبہ کے مطالبہ میں ان بی بی کو بھی شریک کیا گیا۔

اصل یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑا فتنہ ہے جس کی جڑیں نفس کے اندر دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ انسان بہت سے مواقع پر اسی طرح کی کمزوری کی بنا پر نصح کے فرض سے غافل ہو جاتا ہے۔ اور نفس محبت و اعتماد کی کوئی رشوت پا کر یا محض بے تعلقی اور بے پروائی کی وجہ سے احتساب سے ساکت ہو جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سوراخ کرنے والے کشتی کے پیندے میں سوراخ کر دیتے ہیں اور پوری جماعت کا سفینہ غرق ہو جاتا ہے۔ انفال کی اس آیت پر سے گزریئے تو دل کانپ اٹھتا ہے۔ فرمایا ہے۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ	اور اس فتنہ سے بچو جو تم میں خاص کر
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً	انہی کو نہیں پہنچے گا جو ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ	اور جان رکھو کہ اللہ سخت پاداش
الْعِقَابِ	دینے والا ہے۔

یعنی ایک جماعت کے اندر صرف فتنوں کے بانی اور شرارتوں کے مجرم ہی نہیں پکڑے جائیں گے بلکہ جب خدا کا تازیانۂ عذاب نمودار ہوگا تو وہ لوگ بھی اس کی زد میں آئیں گے جو اپنی کمزوریوں کی وجہ سے یا خوفِ ملامت کی وجہ سے، یا بے تعلقی کی وجہ سے یا کسی اور جلی یا خفی ظاہر یا مخفی سبب سے نصح و احتساب کے فرض سے غافل رہیں گے! احادیث میں کشتی والی مثال نے یہ حقیقت بالکل واضح کر دی ہے اور کلکم راع وکلکم مسئول والی حدیث بھی اس پر شاہد ہے۔

آخر میں اس مسئلہ پر غور کیجئے کہ جب اہل بیت اطہار نبوت کے ایک فرد کو اس لئے توبہ کرنے کی ہدایت کی گئی کہ اس نے ایک شخص کے افشائے راز کی غلطی کو جو محض بربنائے اخلاص تھی، بغیر اظہار نکیر و احتساب کے قبول کر لیا تو ان لوگوں کا کیا حشر ہوگا جن کی تن پروریوں اور مصلحت اندیشیوں نے ان کو بالکل مردہ کر کے نفاق کی قبروں میں سلا دیا ہے۔ اور دین و حرمات الٰہی کی کوئی تباہی بھی ان کو بیدار نہیں کرتی!!

۲۔ دوسرے سوال میں یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ نے قرآن مجید و تورات، تفسیر و حدیث اور تاریخ و ادب کی ایسی پیچیدہ اور قدیم النزاع بحث میں "غوث پاک" کا ذکر کس مناسبت سے فرمایا! مولانا نے امام ابن جریرؒ سے تعرض تو اس لئے ناگزیر سمجھا کہ بغیر اس کوہ گراں کو اس کی جگہ سے سرکائے اس بحث کا فیصلہ ناممکن تھا۔ مگر "غوث پاک" کو اس معاملہ سے کیا علاقہ؟ علامہ ابن جریر ایک بلند پایہ مورخ، ایک بلند پایہ مفسر، ایک بلند پایہ محدث ہیں یہانتک کہ اجتہاد و فقہ میں بھی ان کو مجتہد مطلق کا مقام حاصل ہے۔ اور خدا کے فضل سے شعر و ادب اور نحو و اعراب کے مسائل میں بھی اگر وہ دوسروں سے بہت آگے نہیں تو کچھ ایسے پیچھے بھی نہیں۔ ایک ایسے امام جلیل

کی غلطیاں یا ان کے عذرات بتائے بغیر اگر مولانا حمید الدین اس عظیم الشان بحث کا قول آپ کے محض یہ کہکر خاتمہ کردیتے کہ یہ سبائی روایات" ہیں تو میں تو نہیں جانتا کہ آپ کے سوا کوئی صاحب علم بھی ان کی اس بات کو وقعت دیتا لیکن غوث پاک کو اس کوچہ سے کیا نسبت، نحو و اعراب کے مسائل میں لوگ سیبویہ، خلیل، فرا کے حوالے دیتے ہیں، جنید و شبلی و شیخ اکبر کے حوالے نہیں دیتے، اور آپ نے کبھی بھی نہیں سنا ہوگا کہ کسی روایت کی تحقیق و تنقید میں لوگوں نے بایزید بسطامی اور سری سقطی کی رائیں بھی ڈھونڈھنے کی کوشش کی ہے

ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد

اور آپ کو یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیے کہ قبول روایت کے باب میں ہمارے صوفیائے کرام بہت بدنام ہیں، یہاں تک کہ اس طبقہ کے خواص بھی بالعموم اخذ روایات میں بالکل حاطب اللیل ہیں۔ لیکن اس کوتاہی کے لئے ان حضرات کے پاس بھی کچھ عذرات ہیں جو مولانا حمید الدین صاحب کبھی کبھی بیان فرمایا کرتے تھے یہاں اس کے ذکر کا موقع نہیں۔

مولانا حمید الدینؒ کے متعلق یہ بات یاد رکھئے کہ ان کے پیش نظر "عقل الناس اعذر الناس" کی حکمت تھی۔ وہ اہل ایمان کے ساتھ سوء ظن نہیں رکھتے تھے اور انکو علم و مذہب کا ویسا ہی خادم اور حق کا ویسا ہی طالب سمجھتے تھے جیسا خود اپنے کو، اسلئے قدرۃً جب کسی معاملہ میں ان کو اکابر سلف میں سے کسی کی رائے علانیہ غلط معلوم ہوتی تھی اور اس سے وہ اختلاف پر مجبور ہوتے تھے تو اس مسئلہ پر غور کرتے تھے کہ آخر اس غلطی کے اسباب کیا ہوئے ہیں، کیونکہ جب ایک شخص کی بدنیتی اور شرارت کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ تو کوئی وجہ ہوگی کہ اصل حقیقت اس سے مخفی رہ گئی، چنانچہ

ان کی کتابوں پر اگر آپ کی نظر ہے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ ہمیشہ اپنی غیر معصومیوں کے ساتھ دوسروں کی غلط فہمی کے اسباب پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ ابنائے زمانہ کی طرح نہیں تھے۔ جو نہ تو ابن جریر اور امام رازی سے واقف اور نہ "اسرائیلات" و "سبائیات" کے علم البتہ خود ان کے جہل و غرور کی متاع کاسد ہے جس سے انھوں نے اپنی دوکانیں سجا رکھی ہیں فیاللعقول ویاللافہام! میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس فتنہ سے دور رکھے اور عبد شاکر و قانت بننے کی توفیق دے کہ علم کا دروازہ شکر و انابت اور تواضع و خاکساری کے ساتھ حق طلبی ہے۔

آپ کو مولانا کی تحقیق سے اختلاف نہیں ہے، الحمد للہ، لیکن اس سے شکایت ہے کہ مولانا نے اس باب میں علامہ ابن جریرؒ اور دوسرے علما کی غلطی کو ان کی بے تعصبی کی دلیل کیوں ٹھہرایا۔؟ اور ان کو "سبائی روایات" کیوں نہیں کہہ دیا۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ مولانا حکیم تھے۔ ان کا طریق سخن حکما کا تھا، بازاری اور سوقیانہ انداز کلام وہ اگر اختیار کرنا بھی چاہتے تو نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی اس کتاب میں بدلائل قویہ جگہ جگہ ثابت کیا ہے کہ یہ روایات زیادہ تر از قبیل اسرائیلیات ہیں اور مجرد دعوے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ناقابل انکار دلائل سے اس دعوی کو قوت بہم پہنچائی ہے اور پھر علماء یہود کی ان خوفناک شرارتوں کو بے نقاب کرنے کے لیے جو انھوں نے محض نسلی تعصب کی بنا پر کیں، یہاں تک کہ اپنی کتاب میں قطع و برید کر ڈالی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ حضرت اسحاق علیہ السلام کا نام بے موقع و بے محل ڈال دیا، ان علمائے اسلام کی بے تعصبی کا ذکر فرمایا ہے کہ باوجودیکہ ذبح اسمٰعیل کا معاملہ اسلام کی بنیادی اینٹ ہے لیکن چونکہ تفریق بین الرسل اور تفضیل بعض علی بعض کی تعصبا

علمت یہود کی خصوصیت تھی۔ اس لئے ہمارے علما نے اس سے تا بحد امکان احتراز کیا یہاں تک کہ اس بے تعصبی کی افراط ہی تھی جس نے ان کو ایک اصولی مسئلہ میں حق کی تلاش اور جستجو سے غافل کر دیا اور ٹھیک راہ ان پر نہیں کھل سکی۔ میں نہیں سمجھتا کہ علامہ ابن جریر جیسے بلند پایہ مفسرین و مورخین کی بابت اگر مولانا یہ بات نہ کہتے .. . تو کوئی دوسری بات کہکر وہ خدا کو قیامت کے دن کیا جواب دیتے:

یقیناً اس معاملہ میں علامہ ابن جریرؒ سے مسامحت ہوئی، لیکن جبکہ ہمارے پاس اسکا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ ان کو حضرت اسحاقؑ سے بمقابلہ حضرت اسمٰعیلؑ زیادہ تعلق رہا ہو یا یہ کہ یہود نے ان کو اس کے لئے کوئی رشوت دی ہو۔ اور اس کے برعکس یہ قطعی طور پر معلوم ہے کہ بوجوہ گوناگوں ان میں حضرت اسمٰعیلؑ کے لئے اس شرف کو مخصوص کرنے کا داعیہ پیدا ہو سکتا تھا کہ وہ تاریخ اسلام اور فلسفہ اسلام کی پہلی اینٹ ہیں تو لازماً دو باتیں ماننی پڑتی ہیں۔ ایک یہ کہ علامہ ابن جریرؒ نے غلطی کی اور دوسری یہ کہ وہ اس معاملہ میں اس داعیہ تعصب سے بالکل پاک تھے جو علما یہود میں موجود تھا۔ غلطی ان کی دلائل سے ثابت ہے اور بے تعصبی اس بات سے کہ اس باب میں بادنی تامل انھوں نے ذبیح اسحاقؑ کی روایات کو ترجیح دیدی اور یہود کی طرح ان کے اندر حمایت اسمٰعیل علیہ السلام کا داعیہ پیدا نہیں ہوا۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھئے کہ علامہ ابن جریر نے ذبیح اسحٰقؑ کی روایات کو روایات کی بنا پر ترجیح نہیں دی ہے۔ بلکہ ان کے نزدیک قرآن کے دلائل ذبیح اسحاقؑ کی حمایت میں ہیں (دیکھئے رسالہ ذبیح فصل ۴ ۳۴ و ۳۵)

بہر حال مولانا کے نزدیک جس طرح یہ بات ثابت ہے کہ ذبیح اسحاقؑ کی روایات

تمام تر علمائے یہود سے ماخوذ ہیں (دیکھئے باب ۲ فصل ۳۳) اسی طرح علمائے اسلام کی اس معاملہ میں بے تعصبی بھی واضح ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ اس واضح بات سے آپ کو انکار کیوں ہے؟

میں اس دعا میں آپ کے ساتھ شریک ہوں کہ مسلمان "سبائی روایات" میں امتیاز کرنے کے جلد قابل ہو جائیں لیکن ابنائے زمانہ کی جلد بازی اور ان کے جہل و ادعا سے سخت مایوس ہوں کہ یہ ریت سے بھاگنے والے کہیں آگ کے الاؤ میں نہ پھاند پڑیں کہ آنکھیں بند ہیں اور باگ جنون بے خرد کے ہاتھ میں ہے - اللہ تعالیٰ ہم سب کا مددگار ہو

تفسیر سورہ اخلاص

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ نے سورہ اخلاص کی تفسیر اردو میں لکھی ہے۔ اس سورہ کی، ہر دور میں بیشمار تفسیریں لکھی گئی۔ لیکن اہل نظر نے اعتراف کیا ہے کہ علامہ فراہیؒ کی تفسیر میں جو نکتے بیان ہوئے ہیں، ان سے تمام تفسیریں خالی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین، کاغذ نہایت عمدہ۔ قیمت ۵ ر

تفسیر سورہ لہب

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفسیر سورہ لہب کا اردو ترجمہ ہے اس میں عام خیال کی مدلل تردید کی گئی ہے کہ یہ سورہ بد دعا ہے۔ ابولہب اور اس کی بیوی کے وجوہ ذکر نہایت اثر انگیز ہیں۔ اس تفسیر کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے

کتابت و طباعت بہترین، کاغذ عمدہ۔ قیمت بر اردو ۲ ر عربی ۸ ر

منیجر

حکمت غرب

مارکس ایریلیس کے خیالات

از جناب مولوی نیاز احمد صاحب صدیقی یم اے۔

اس کا احترام کر جو کائنات عالم میں سب سے ارفع ہے، یعنی وہ قوت جو تمام چیزوں کی کارفرما ہے اور جو سب کو ایک غایت کے لئے استعمال کر رہی ہے اور اسی طرح اس کا بھی احترام کر جو تیرے اندر سب سے ارفع ہے۔ یہ الفاظ دیگر وہ اصول جو اول الذکر کے مماثل ہے کیونکہ تیرے اندر یہ ہی چیز ہے جو تمام دوسری چیزوں پر کارفرما اور تیری زندگی پر نگراں ہے۔

جس چیز سے مجموعہ کو نقصان نہیں پہنچا اس سے فرد کو بھی کوئی ضرر نہیں۔ جہاں مضرت نظر آئے اس اصول کو یاد کر! اگر اس سے جماعت کو کوئی گزند نہیں پہنچا ہے تو مجھے بھی کوئی گزند نہیں پہنچا اور اگر جماعت کو نقصان پہنچا ہے تو میرا کام یہ نہیں کہ نقصان پہنچانے والے کے خلاف غصہ کا اظہار کروں بلکہ اسکی غلطی پر اس کو نصیحت کرنی چاہئے۔

بار بار اس بات کو یاد کر کہ کتنی برق رفتاری کے ساتھ تمام اشیاء واقعی اور نیم واقعی، ہمارے سامنے آتیں اور پھر ہٹالی جاتی ہیں۔ مادہ ایک چشمہ رواں ہے۔ عمل کی استواری کا مدٗ

اس کی حرکت پر ہے، اسباب ہزارہا تبدیلیاں قبول کرتے ہیں۔ کوئی چیز اپنی جگہ پر قائم نہیں رہتی۔ زمانہ گذشتہ اور آیندہ کا غار قریب ہی واقع ہے جس میں ساری چیزیں غائب ہوتی جاتی ہیں۔ پس ایسے ماحول میں ایک احمق کے سوا کون غرور سے متوالا ہوگا یا فکر سے پریشان ہوگا یا اس خیال سے بدحال ہوگا کہ اس کے مصائب تادیر قائم رہیں گے!

اس عالمگیر مادہ کو یاد کر جس کا صرف ایک حقیر ذرہ تیرے حصہ میں آیا ہے اس ہمہ گیر زمانہ کو یاد کر جس کا صرف ایک لحظ تیرے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ اس وسیع قسمت کو یاد کر جس کے قلیل ترین حصہ کا تو حامل ہے!!

کیا میرا پڑوسی میرے خلاف گناہ کرتا ہے؟ اس معاملہ پر اسی کو غور کرنا چاہئے۔ اپنی سیرت اور اپنے اعمال کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ میرے پاس اس وقت وہی ہے جو عالمگیر فطرت چاہتی ہے کہ میرے پاس ہو۔ اور میری زندگی اسی طرح گذر رہی ہے جیسا کہ میری اپنی فطرت چاہتی ہے کہ میں زندگی بسر کروں۔

اس بات کا خیال رکھ کہ تیری روح کا وہ حصہ جو رہنما اور کارفرما ہے، مادی جذبات سے چاہے وہ لطیف اور خوشگوار ہوں، یا تلخ و ناگوار، بالکل غیر متاثر رہے، جسم سے اسکا اختلاط نہ ہونے دے۔ بلکہ ایک دیوار سی اسکو اپنے تئیں گویا محصور کر لینا چاہئے، شہوانی جذبات کو انہیں اعضا کے اندر محصور کر دے جنکو یہ جذبات متاثر کر سکتے ہیں لیکن اگر اس دوسری ہمدردی کی وجہ سے، جو ایک متوازن جسم میں قدرۃً ہوتی ہے ان جذبات کی رسائی، دماغ تک ہو جائے تو پھر اس اضطرار حسی کی بندش کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ یہ قانون فطرت ہے۔ لیکن عقل کیلئے یہ مناسب ہے کہ وہ ناحق اس اضطرار حسی پر خیر یا شر کا حکم نہ لگائے

تلخیصات

افکار جدیدہ

آمریت کا طریق کار

از

جناب مولوی عزیز الرحمن صاحب اصلاحی

فرانسیسی مصنف جارج برنار نے اس عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے، جس سے پیرس کے سیاسی حلقوں میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا ہے۔ اس نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ موجودہ آمریت نے ان قدیم اور بدترین طریقوں کو زندہ کردیا ہے۔ جن کے بابت ہمارا خیال ہے کہ ان سے تہذیب انسانی کے تمام پچھلے نقوش مٹ گئے ہیں۔ ہٹلر مذہبی اقلیتوں کے ساتھ جس ظالمانہ برتاؤ کے ساتھ پیش آرہا ہے وہ ٹھیک ویسا ہی ہے جس طرح کے ظالمانہ برتاؤ شارل نہم اور لوئی چہاردہم اپنی اقلیتوں کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ وہ اور اس کا ہم مشرب مسولینی، دونوں کے دونوں عہدناموں کی دھجیاں بکھیرنے میں ویسے ہی بیباک ہیں جیسے گذشتہ زمانہ میں نپولین۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مسولینی نے حبشہ و البانیہ جیت کر قیصر الیوریا اس فتح الجزائر کی یاد تازہ کردی ہے۔

الغرض آمریت قدیم تعصب اور ملک گیری کے طریقوں کو زندہ کر رہی ہے۔ اور اور یہی چیز یورپ کی موجودہ صورت حالات کے لئے خطرے کا سبب بن سکتی ہے۔ اس لئے اگر جمہوری حکومتیں اس عفریت فساد کو قدغن کرنا چاہتی ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ اپنا کوئی بہترین نمونہ پیش کریں۔ اور خود ان کے اندر جس طرح کے جو رسوم جاہلیت باقی ہیں انکی اصلاح کی کوشش کریں۔ ان پست اقوام کے ساتھ انصاف کریں جن کے حق کو وہ مار بیٹھی ہیں۔ انھیں زیادہ سے زیادہ آزادی دیں اور اپنے اس عمل سے جمہوریت اور آمریت کے اصلی فرق کو واضح کر دیں۔

صرف یہ کافی نہیں ہے کہ ہم آمری حکومتوں پر غالب آنے اور رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے ان پر ملک گیری و استعماریت کا الزام لگائیں بلکہ ہمیں چاہیے کہ ہم اس استعماری میلان کا مقابلہ کریں جو ہمارے دلوں میں کارفرما ہے اور ہم اپنی پالیٹکس سے اس کی بیخ و بن تک اکھاڑ دیں اس طرح ہم چھوٹی چھوٹی حکومتوں کا اعتماد حاصل کر سکتے ہیں اور پارلیمنٹری حق کے احترام کو مضبوط کر سکتے ہیں نیز ہم صحیح ڈیماکریسی کی عمارت کھڑی کر سکتے ہیں۔

فرانس کا جدید میلان

آج کل فرانس میں، فرانسیسی شہنشاہیت کے تخیل کو زندہ کرنے اور اسے رومن شہنشاہیت کے اصول پر چلانے کا رجحان پیدا ہو رہا ہے۔

مشہور ادیب وجرنلسٹ بیر دومنک نے اس پر ایک رسالہ لکھا ہے جس میں اس نے فرانس کے مستقبل کے بابت پیشنگوئی کی ہے اور اس کی شہنشاہیت کے انجام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہمارے ملک میں پیداوار کی کمی ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ

ہم اپنی شہنشاہیت کو فروغ دینے کی طرف متوجہ ہوں اور اس کے لئے ناگزیر ہے کہ ہم رومن امپائر کی طرف مڑ کے دیکھیں اور ان اصول و نظریات کی پیروی کریں جو اس کی عمارت کے اساس تھے۔ ان میں اہم ترین اصول یہ ہے کہ اجنبی عناصر کو اپنے اندر جگہ دی جائے اور ان کو حکومت کے مزاج میں دخل حاصل کرنے کا موقع دیا جائے، ان کی مادی و معنوی ترقی کیلئے ایسی جد و جہد کی جائے کہ وہ جسم شہنشاہیت کے ایک باکار عضو بن جائیں۔ اب سوال یہ ہے کہ فرانسیسی شہنشاہیت کیسے زندہ ہو سکتی ہے اور کیونکر ترقی و کامیابی کے مدارج طے کر سکتی ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ وہ آزاد خیال قوموں کا ایسا فیڈریشن ہو جس میں رہ کر ہر قوم زیادہ سے زیادہ داخلی آزادی سے فائدہ اٹھا سکتی ہو اور ہر قوم کی مذہبی، لسانی اور تمدنی آزادی کلیۃً محفوظ ہو جس کا ہر فرد مرکزی گورنمنٹ سے فرانسیسی ہم وطن کے خطاب کا مطالبہ کر سکتا ہو اور حکومت کا یہ فرض ہو کہ یہ خطاب اس کو اس وقت عطا کرے جب اس کے اندر وطن و شہنشاہیت سے ہمدردی و اخلاص کے جذبات بدرجہ کمال موجود ہوں۔

یہ ہے مسیو پیردومنک کی نصیحت جس پر انھوں نے فرانس کو غور کرنے کی دعوت دی ہے حقیقت یہ ہے کہ فرانس کے بعض مقبوضات پر اٹلی نے جو اپنا اقتدار جمانے کی خواہش کی ہے تو فرانسیسیوں کے دلوں میں شہنشاہیت کے برقرار رکھنے کا جذبہ پوری طاقت کے ساتھ بھڑک اٹھا ہے اور وہ اپنے فرسودہ نظام کی رگوں میں تازہ خون لانا چاہتے ہیں کہ وہ بدلتے ہوئے موسم کے اثرات کا مقابلہ کر سکے۔

ظاہر ہے کہ فرانس کا یہ نظریہ فاشزم کے بالکل ضد ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ فسطائیت و نازیت قومیت کو پاک کرنے اور اجنبی عناصر کو نکال باہر کرنے کا پروپگنڈا کر رہی ہیں۔ فرانس جنہوں [illegible] میں ہوا کا [illegible] ہوگیا

ان خیالات نے فرانس کے افراد، ہاؤس آف لارڈز کے ممبران اور موجودہ وزراء کی ایک بڑی جماعت کے دلوں میں اپنی جگہ پیدا کرلی ہے

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
NATIONAL MUSLIM UNIVE... DELHI.

گذشتہ جنگ کے اسباق

...وڈ کی مصنف ہنری بیدد جنگ عظیم کے متعلق ایک اہم کتاب شائع کی ہے جس میں اس نے ان مختلف اسباب کو گنایا ہے جو جنگ کی آگ کو مختلف صورتوں سے بھڑکانے میں مدد معاون ہوئے۔

جو شخص بھی اس کتاب کو پڑھے۔ وہ اس کی روشنی میں دور حاضر کے واقعات کی نسبت بہتر طریقہ پر سوچ سکتا ہے اور وہ بے تکلف اس حقیقت کا اعتراف کریگا کہ تاریخ اپنے کو دہراتی ہے

جرمنی ملک گیری کے ترانے گا رہا تھا اور اپنی فرمانروائی و اقتدار کے دائرہ کو برلن سے بغداد تک وسیع کرنیکا خواب دیکھ رہا تھا۔ نیز ترکی بلغاریہ کے واسطے سے بلقان اور مشرقی بحر متوسط میں دشمنوں کی سرگرمیوں کا قلع قمع کر دینا چاہتا تھا۔ ان سب کے مقابلہ کیلئے برطانیہ نے اسکے خلاف حکومتوں کا جو محاذ قائم کیا تھا اسمیں برطانیہ کی کامیابی کا امکان اسکے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

آج تقریباً وہی صورت حال درپیش ہے جیسی کل ہمارے سامنے گذر چکی ہے۔ جرمنی کا خواب بھی بدلا نہیں ہے اور آج آسٹریا و ترکی کے بجائے اٹلی و سپین اسکے ساتھ ہیں اور وہ انکے ذریعہ اپنے اس خواب کو بحر متوسط میں رفتہ رفتہ پورا کرنا چاہتا ہے۔

بایں ہمہ صورت حال دو باتوں میں پہلے سے مختلف ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس مرتبہ انگلینڈ نے آخر وقت میں جا کر اپنے چہرہ سے نقاب ہٹائی اور بلجیم پر حملہ کے بعد اپنی جنگی تیاریوں کا اعلان کیا ابکے اسنے جو پالیسی اختیار کی ہے وہ قدیم پالیسی سے مختلف ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انگلینڈ نے جارحانہ حملوں کے دفاع کیلئے ایک محاذ بنانے کا قانونی طور پر اعلان کر دیا ہے اور یہ تدبیر بھی پہلے تجربہ سے فائدہ اٹھا کر، اس مرتبہ عین وقت پر شروع کی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ولیم کی فوج نے برطانیہ کا صحیح پوزیشن معلوم کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن اسکی یہ پالیسی واضح نہیں ہوئی۔ اس وجہ سے جرمنی نے سمجھ لیا کہ برطانیہ اب بھی کوئی ویسی ہی غیر جانبدارانہ پالیسی اختیار کریگا جیسی اس سے پیشتر جنگوں میں اختیار کر چکا ہے۔

لیکن ابکے بظاہر حالات کچھ مختلف ہیں گو تجربہ کاروں کے تجربہ کی صداقت کا امکان بھی باقی ہے۔

یہ ایک سوال ہے!

تفسیر سورہ عصر

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورہ عصر کا اردو ترجمہ ہے۔ تفسیر خصوصیت کے ساتھ بعض دقیق مباحث قرآنی کی حامل ہے۔ لفظ عصر کی تحقیق اور اللہ کے قسم کی تاویل نہایت بصیرت افروز ہے۔ آخر میں ایمان کے مفہوم اور حق و صبر کے باہمی تعلق کی تشریح بھی بڑی اثر انگیز اور ایمان افروز ہے۔ تقطیع $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$ حجم ۶۶ صفحے۔ کاغذ عمدہ۔ کتابت و طباعت جاذب نظر۔ قیمت ۶/

تفسیر سورہ لہب

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی تفسیر سورہ لہب کا اردو ترجمہ ہے۔ اسمیں عام خیال کی مدلل تردید کی گئی ہے کہ یہ سورہ بددعا ہے۔ ابولہب اور اس کی بیوی کے وجوہ ذکر نہایت اثر انگیز ہیں۔ اس تفسیر کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا۔ کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ نہایت عمدہ۔ حجم ۴۰ صفحے۔ قیمت ۶/

تفسیر سورہ کافرون

اس میں ہجرت اور برأت کا اصلی فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ اور نبوت کے مراحل و مقامات کی توضیح اس قدر حکیمانہ انداز میں کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی بیشمار مشکلات آپ سے آپ حل ہو گئی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ عمدہ۔ تقطیع $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$ ضخامت ۴۰ صفحے۔ قیمت ۳/

منیجر

رجسٹرڈ نمبر ل ۳۹۹۲

دائرۂ حمیدیہ کی اعانت

دائرہ حمیدیہ کی خدمت و اعانت، کتاب الٰہی کی خدمت و اعانت ہے۔ اسکی تین صورتیں

جو حضرات سو روپے یکمشت دائرہ کو عنایت فرمائیں گے وہ دائرہ کے معاون دائمی

گے۔ ان کو دائرہ کا رسالہ الاصلاح اور تمام مطبوعات ہدیۃً دی جائیں گی۔

جو حضرات پچاس روپے یکمشت عنایت فرمائیں گے ان کو رسالہ الاصلاح اور دو

سری مطبوعات برابر نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

۳- جو حضرات دس روپے سالانہ عنایت فرمائیں گے ان کی خدمت میں الاصلاح

جاری کیا جائے گا اور سال بھر کی مطبوعات بلاقیمت بھیجی جائیں گی۔

Accession
Date

ہدایات و قواعد

۱- "الاصلاح" ہر انگریزی مہینہ کی پندرہ تک شائع ہوگا۔

۲- اگر مہینہ کے آخر تک پرچہ نہ پہنچے تو فوراً دفتر کو لکھ کر منگوا لیجیے ورنہ بقیمت بھیجا جائے گا۔

مضامین وغیرہ اڈیٹر کے نام بھیجیے اور دفتر سے متعلق امور کیلئے تمام خط و کتابت منیجر سے کیجیے۔

۴- دفتر سے خط و کتابت کرنے میں خریداروں کو نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے۔

۵- چندہ سالانہ چار روپے۔ بیرون ہند کے لئے چھ روپے۔ فی پرچہ چھ آنے۔

الاصلاحی منیجر دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڈھ

طابع و ناشر نے اصلاح پریس سرائے میر اعظم گڈھ میں چھپوا کر شائع کیا